ماہنامہ
نومبر 2025ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

یومِ اقبال

IQBAL DAY

9th November

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
نومبر 2025ء

جلد 78 | شمارہ نمبر 11

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: تُو آئے تو لگتا ہے اپنی بھی سحر ہوگی	ادارہ	4
اقبالؒ اور پرویزؒ	محمد سلیم اختر خان	12
غلام احمد پرویزؒ سے علامہ اقبالؒ کے متعلق انٹرویو	ایم۔ایس۔ناز	23
جلوۂ سروش، نوائے سروش اور حرکت بہ وادیٔ یرغمید	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ	30
صحت احادیث کا ایک خاص معیار	مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری ندوی	56

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) **Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) – Message to Fellow-Seekers** **By G. A. Parwez , Translated by: M. Alam**	**60**
Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) **We are also Muslims like other Muslims** **By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)**	**63**

Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

نوجوان دوستوں کے نام

تُو آئے تو لگتا ہے اپنی بھی سحر ہو گی!

طلوع اسلام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن مجید کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے، خاص طور پر نوجوانوں کو قرآن کے اصول وقوانین سے آگاہ کیا جائے۔ قرآن پڑھنا سمجھنا اور پھر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، جو لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں ان کو قرآن سمجھانا ہر پڑھے لکھے مسلمان پر فرض ہے۔

(دیکھئے القصص:87-85، قٓ:45، المائدہ:67)

ہمارے قارئین یہ پوچھتے رہتے ہیں جن میں نوجوان طالب علموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے کہ ہم کیا کریں؟ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ طلوع اسلام کی وجہ سے قرآن کی تعلیمات سے تو ہم فیض یاب ہو ہی رہے ہیں، قرآن کا نظام ربوبیت بھی ہم سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنی عملی زندگی میں ان کا نفاذ کیسے کریں؟ یہ وہ سوال ہے جو طلوع اسلام پڑھنے والے اکثر نوجوان ہمیشہ سے سوچتے اور پوچھتے چلے آ رہے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن کریم کے اصول وقوانین کو کس طرح نافذ کریں؟

کچھ نہ کچھ کرنے کی آرزو عام طور پر ہر باشعور انسان کے دل میں ضرور ہوتی ہے، جب کوئی نوجوان مسلمان قرآن پڑھتا اور سمجھنے لگتا ہے تو اس کے دل میں کچھ اچھا کر گزرنے کی خواہش زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ قرآن کی روشنی میں اپنے معاشرے کی بہتری کے لیے کیا اور کیسے کرے؟ قرآن کریم کی ہدایات میں سے ہم اپنے نوجوانوں کو چند ضروری باتیں سمجھانا چاہتے ہیں۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآنی تعلیمات پر انفرادی اور اجتماعی طور پر عمل کرنا آسان کام نہیں ہے، قدم قدم پر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات قرآن کریم میں ہمیں اس طرح سمجھائی گئی ہے کہ: (مفہوم)

وحی کی راہ نمائی تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دینا چاہتی ہے، لیکن چونکہ اِس سے اِنفرادی مفاد چاہنے والوں کے مقاصد پر زد پڑتی ہے، اِس لیے وہ اِس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اِس جنتی معاشرہ کے قائم کرنے کے لیے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سو، اے جماعتِ مومنین! تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اِس معاشرہ کو یونہی قائم کر لو گے

اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی اُن جاں گداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اِس سے پہلے اِس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ اُن کی شدت سے اُن کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارالٰہا! ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر اُن کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور تائید ایزدی اُن کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔ تمہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا ہوگا۔ (البقرہ:214)

یہی بات دوسری جگہ سورہ البقرہ :157-155 میں اس طرح سمجھائی جا رہی ہے:

اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے جن میں تمہیں اِس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ تمہاری صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ (ٹکراؤ کے بغیر انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر ہی نہیں سکتا۔ مزید دیکھئے، الملک:2) اس میں کہیں جنگ وقتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا تو کبھی کھانے پینے کے سامان کی کمی ہوگی۔ کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا۔ کہیں کھیت اور باغ اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن آخرالامر فتح و کامرانی کی خوش خبریاں ان کے لیے ہوں گی جو اِس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں اُن کی نگاہیں، اِس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصدِ زندگی نظامِ خداوندی کا قیام بنے۔ ہم نے اپنے آپ کو اِس کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اِسی نصب العین کی طرف اٹھے گا وہی ہمارا مقصود و منتہٰی ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ انہیں اُس کے قانون کی تائید حاصل ہے انہی کے لیے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور الطاف و اکرام کی بارشیں ہیں اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (البقرہ : 157-155)

قرآن کی روشن راہنمائی میں عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان بھی اسی طرح کا ہو جس طرح قرآن کریم میں بتایا گیا ہے۔ ہمارا ایمان کس طرح کا ہونا چاہیے اس کے لیے پڑھیے: (مفہوم)

ان (مخالفین) سے کہو کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون سا مسلک ہے جسے اختیار کر کے ہم تمہاری خود ساختہ گروہ بندی اور نسل پرستی سے بلند ہو چکے ہیں۔ وہ مسلک یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس ضابطہء حیات پر ایمان رکھتے ہیں جو اُس نے (اِس رسول کے ذریعے) ہماری طرف بھیجا ہے۔ (یہ، اپنی اصل کے اعتبار سے اُسی قسم کا ضابطہء حیات ہے جس قسم کا اس سے پہلے) ابراہیم و اسماعیل و اسحٰق و یعقوب اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی طرف نازل ہوا تھا۔ ہم اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں بھی (اپنے اپنے وقت میں) خدا کی طرف سے ضوابطِ حیات ملے تھے۔ نیز موسیٰ کو بھی اور عیسیٰ کو بھی۔ بلکہ تمام انبیاء کو۔ ہم ان تمام انبیاء کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھتے ہیں اور نبی ہونے کی جہت سے اُن میں سے کسی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ مسلک جس کی رو سے ہم خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہ ہے

ہماری دعوت۔ اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح اس ضابطہء حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو اُس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں گے اور اگر یہ اِس سے اعراض برتیں گے تو اُن کا یہ اعراض اُس راستے سے ہٹ جانے کے مترادف ہوگا جس پر تمام انبیاءؑ سابقہ چلتے رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اِس راستے کو اختیار نہ کیا اور اپنی ضد پر قائم رہے' تو ان کی مخالفت بدستور رہے گی لیکن تمہیں اس کی قطعاً پروا نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے نظام میں' جس کی تم اطاعت کرتے ہو' اتنی قوت موجود ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔ اِس لیے کہ یہ اُس خدا کا نظام ہے جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ (البقرہ:137-136)

یہی بات اس طرح بھی سمجھائی گئی ہے:

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (اللہ کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لیے باعث تقویت بنتی ہیں، الاحزاب:43) اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لیے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ دیکھیں مفہوم القرآن 41:30' (3:124-125' 12-8:10' 46:13)۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لیے تمہیں یہ جنتی زندگی اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی)۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے ہوگا جو مانگو گے ملے گا، یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)۔ اور یہ سب کچھ ایسی عزت و توقیر کے ساتھ ملے گا جیسے میزبان اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے اس میں اللہ کی طرف سے زندگی کے خطرات سے حفاظت کا سامان بھی ہوگا اور سامانِ نشوونما بھی۔ اس کے بعد بتاؤ کہ اس شخص کی بات سے زیادہ حسین اور جاذب بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو لوگوں کو قانونِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے اور (اس طرح اپنی عملی زندگی سے ثابت کر دیتا ہے کہ) وہ ان میں سے ہے جو مسلمین ہیں یعنی ان لوگوں میں سے ہے جو قوانین خداوندی کے اطاعت گزار ہیں۔ یاد رکھو! معاشرہ اور انسانی ذات میں حسن پیدا کرنے والے کام اور ایسے کام جن سے بگاڑ پیدا ہو نتیجہ کے اعتبار سے کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے (یعنی اچھے اور برے کام ایک جیسے نہیں ہو سکتے) اگر معاشرہ میں ناہمواریاں (یعنی خرابیاں) پیدا ہو جائیں تو ان کے ازالے کی بہترین صورت یہ ہے کہ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرنے والے کام کیے جائیں۔ (اس سے غلط کاموں کے مضر اثرات کا ازالہ بھی ہو جائے گا اور آئندہ کے لیے بگاڑ بھی رک جائے گا۔ نیز اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ) وہ شخص جس کی طرف سے بگاڑ پیدا کرنے والی حرکت سرزد ہوئی تھی اس میں اور تم میں اگر سخت عداوت ہوگی تو وہ تمہارا گرمجوش دوست بن جائے گا۔ (برائی کو بھلائی سے روکنے کا یہ طریقہ ہے لیکن یہ طریق

انہی کی صورت میں کارگر ہوسکتا ہے جن میں اصلاح کا امکان ہو۔ جو مخالفت کی آخری حد تک پہنچ چکے ہوں ان کے علاج کے لیے سختی کی ضرورت پڑے گی)۔ لیکن یہ طریق کار ہے بڑا مشکل اور اس پر عمل پیرا وہی ہوسکتا ہے جو نہایت مستقل مزاج ہو، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس شخص کو اس طریق کار کی توفیق نصیب ہوجائے تو وہ بڑی کامیابیوں اور کامرانیوں کا مالک ہوگا۔ یہ کام دشوار اس لیے ہے کہ سرکش قوتیں اور خود تمہارے سطحی مفاد پر مبنی جذبات اس کی کوشش کریں گے کہ تمہاری اس روش میں بگاڑ کی صورت پیدا کردیں۔ ایسی صورت میں اس کا علاج یہ ہے کہ تم اور شدت سے قوانین خداوندی کی پیروی کرنے لگ جاؤ۔ اس سے تمہیں ان تخریبی عناصر کی فساد انگیزیوں سے پناہ مل جائے گی۔ یاد رکھو! اللہ ہر بات کا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (حٰمٓ السجدہ:36-30)

قرآن حکیم آسمانی دستور حیات ہے۔ دستور یا آئین Constitution کسی معاشرے پر لاگو کرنے کے لیے ہوتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہوتا ہے اور ایسے بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآن کریم کو بطور آئین نافذ کرنا ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ہدایت دی:

ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا کہ سرِ دست مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے، وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کردو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ تم اپنی پارٹی کے لیے کوئی تربیتی مرکز بناؤ جہاں ان کے اجتماعات ہوا کریں اس لیے) تم فی الحال اپنی جماعت کے ممبروں کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کردو اور اس طرح اس نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کردو (جسے آخرالامر تمام معاشرہ کو محیط ہوجانا ہے) اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج وثمرات کی خوش خبری دیتے رہو (تاکہ ان کی ہمتیں تازہ اور حوصلے بلند رہیں)۔

اوپر لکھی ہوئی آیت مبارکہ (یونس:87) جو ابھی آپ نے پڑھی ہے اس پر زیادہ توجہ دیجیے۔ قرآن کریم کی ہر آیت ہماری پوری پوری توجہ چاہتی ہے، اس آیت مبارکہ میں ہدایت دی جارہی ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بنالو۔ ہمارے اور آپ کے گھر کسی بھی مملکت کے سب سے چھوٹے یونٹ ہوتے ہیں یعنی ایک ایک گھر سے مل کر ایک گلی اور پھر ایک محلہ اور پھر قصبے اور شہر بنتے ہیں، ہمارے گھر ہمارے ملک کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں Units ہیں جن سے مل کر گلی، محلے اور شہر بنتے ہیں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ اگر معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو قرآن کریم پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بنالیں اور نظامِ صلوٰۃ قائم کریں۔ مزید غور فرمایئے کہ جس چیز کو ہم معاشرہ Society کہتے ہیں وہ ہمارے آپ کے کھلے ہوئے گھروں کا نام ہے۔ صبح سویرے ہم سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اپنے اپنے کام دھندوں کے لئے دفتروں، کارخانوں، بازاروں اور تعلیمی اداروں وغیرہ کے لئے چل پڑتے ہیں۔ آپ یہ سوچئے کہ جس قسم کے کردار کے لوگ گھروں میں رہتے ہیں وہی کردار معاشرے میں ہوں گے، اگر گھروں میں نیک لوگ رہتے ہوں گے تو معاشرہ بھی اچھے انسانوں کا ہوگا۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ ہمارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے اور ہم اچھے اور اعلیٰ کردار کے انسان اور مسلمان

بننا چاہتے ہیں جو کسی بھی بگڑے ہوئے معاشرے میں بہت ہی مشکل کام ہے تو اس کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو مرکزِ توجہ بنالو اور الصلوٰۃ قائم کرو۔ اگر آپ اپنے گھرانے کے سربراہ ہیں یا ذمہ دار فرد ہیں تو آپ کے لئے آپ کا گھر ایک ایسی جگہ ہے جہاں آپ گویا بادشاہ اور مکمل طور پر خود مختار ہوتے ہیں جہاں آپ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی بھی نہیں ۔ یہ باتیں ہم ان نوجوانوں کو سمجھانے کے لیے لکھ رہے ہیں جن کی تمنا ہے کہ وہ قرآن کریم کی رہنمائی میں اپنے معاشرے کے لیے اچھے کام کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمیں ایک حکم مختلف انداز سے بھی واضح کر کے فرمایا ہے۔ پہلے ہمیں ہدایت دی گئی کہ اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بناؤ دوسرے مقام پر جو ہدایت دی جارہی ہے اس پر بھی توجہ فرمائیے:

(اے رسولؐ!) تم ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی کوئی طول وطویل لیکچر دینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے لیے ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو! اگر تم نے ذرا بھی غور وفکر سے کام لیا تو تمہیں نظر آجائے گا کہ یہ رسول (جو تمہیں دن رات اس قسم کی نصیحتیں کرتا رہتا ہے معاذاللہ ثم معاذاللہ) کوئی پاگل نہیں (اس کی باتوں میں معاذ اللہ جنون Madness نہیں ہے)، اس کی ہر بات علم وبصیرت پر مبنی ہے اور اسی علم وبصیرت کی روشنی میں وہ تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے قبل از وقت متنبہ کر رہا ہے۔ (سبا:46)

یونس:87 میں ہدایت دی جارہی ہے کہ انفرادی طور پر ہم اپنے اپنے گھروں کو مرکزِ توجہ بنالیں اور صلوٰۃ قائم کریں جب کہ سبا:46 میں ہمیں کہا جارہا ہے کہ تم اللہ کے لیے ایک ایک اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر غور وفکر کرو۔ اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جیسی عظیم ترین ہستی، اتنی بڑی کائنات کا مالک ہم فانی انسانوں کو جو کہ آج کے دور میں اربوں کی تعداد میں ہیں ان میں سے ایک ایک فرد کو یہ حکم اور ہدایت دے رہا ہے کہ تم (سب کے سب اگر نہ سہی تو) اللہ کے لئے اکیلے اکیلے اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں علم وبصیرت پر مبنی ہیں۔)

یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ کسی بھی بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآن کریم کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے ہمارے کردار میں صبر واستقامت کے ساتھ عزم وہمت کا ہونا بہت ضروری ہے، عزم وہمت کے ساتھ ہی ہم انفرادی طور پر اور پھر اجتماعی طور قرآن پر عمل کر سکیں گے، مثلاً:

لقمان نے اپنے بیٹے سے یہ بھی کہا کہ تم نظام صلوٰۃ کو قائم کرو جس بات کو وحی خداوندی جائز قرار دے اس کا حکم دو۔ جسے وہ معیوب کہے اس سے لوگوں کو روکو۔ اس نظام کے قیام اور بقا کی جدوجہد میں تمہیں جو مشکلات بھی پیش آئیں ان میں ہمیشہ ثابت قدم رہو۔ یاد رکھو! مصائب اور مشکلات میں ثابت قدم رہنا (عزم الامور یعنی) ہمت کے کام ہیں اور اس کے لیے بڑے مستحکم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (لقمان:17)

یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہر اس شخص کے لئے اسوہ حسنہ Model Character ہے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کی نتیجہ خیزی پر یقین کامل رکھتا ہو (الاحزاب:21) دین خداوندی کے مقابلے میں

رشتہ داری کے تعلقات کی حیثیت کیا رہ جایا کرتی ہے اس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقا کے طرزِ عمل کو بہترین نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے (الممتحنہ 7-4)

جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور حسین ترین مضبوط کردار کی بات کرتے ہیں تو ان کے کردار کی بہت ساری خصوصیات میں سے دو عظیم اور اہم ترین خوبیاں تھیں صداقت اور امانت، نبوت سے قبل ہی ان کو اپنے اور بیگانے سب صادق اور امین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی سچ بات کہنے کا حکم دیا ہے، نہ صرف سچ اور حق بات کہنے کا حکم دیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ صاف اور سیدھی بات کیا کرو خاص طور پر جب کسی معاملے میں تمہاری گواہی Witness کی ضرورت پڑے تو تم اللہ کی طرف سے گواہ بن کر شہادت دو، توڑ مروڑ کر اور پیچ دار بات نہ کیا کرو، صاف اور سیدھے لفظوں میں ہر حال میں سچ کہنا ہے یہاں تک کہ تمہارا سچ تمہارے اپنے، تمہارے والدین کے اور اقربین کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ دیکھئے الاحزاب:71-70 اور النساء:135

قرآنی آیات کی روشنی میں جو باتیں ہم نوجوانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں کہ:

1۔ زندگی کے ہر موڑ اور ہر معاملے میں صادق اور امین بننا ہوگا۔

2۔ بات صاف اور سیدھی کیا کرو۔

3۔ اللہ کے لیے اکیلے اکیلے اور دو دو کر کے کھڑے ہو کر سوچنا ہوگا۔

4۔ اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بنانا ہوگا۔

5۔ قرآن کے احکام پر عمل ہم چاہے انفرادی طور پر کریں یا اجتماعی طور پر قدم قدم پر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا ہوگا جس کے لئے صبر و استقامت، عزم و ہمت کے ساتھ تحمل اور برداشت کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔

کسی بھی بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآن کی راہنمائی میں مومنوں والی زندگی گزارنا آسان کام نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور ان کے عظیم کردار میں ہمارے دکھوں کا مداوا اور مسائل کا حل موجود ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں سے یہ کہیں گے کہ اس مضمون کی روشنی میں اپنی سوچ اور عمل کا جائزہ لیجئے، محاسبہ کرتے کرتے اگر ایسا لگے کہ ابھی آپ کو اور مضبوط ہونا ہے تو اپنے آپ کو خوب سے خوب تر بنائیے۔ یہاں ہم اپنے نوجوان دوستوں کو دو مشورے دینا چاہیں گے۔

پہلا مشورہ یہ ہے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کریں۔ پڑھیں بھی تو اس طرح کہ آپ کے ہاتھوں میں قلم اور ایک نوٹ بک ہونا ضروری ہے تاکہ قرآن کی آیات مبارکہ اور ان میں آئے ہوئے الفاظ کے معانی و مطالب لکھ کر یاد کریں، اگر ہمارے کہنے سے پہلے ہی قرآن مجید کے نوٹس Notes لے کر پڑھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔ اپنی اس عادت کو برقرار رکھئے Keep it up ۔ محترم پرویز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا درس سننے کے بعد جب کبھی کوئی نوجوان طالب علم اپنی ڈائری یا آٹو گراف بک ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہتا کہ سر! پلیز اپنے آٹو

گراف دے دیجئے تو پرویز صاحب ذرا سا سر جھکا کر اپنے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں سے بظاہر بے نیازی کی ایک نظر ڈالتے ہوئے آٹوگراف مانگنے والے نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھتے اور حکم دینے کے انداز میں فرماتے کہ "میرے درس کو لکھ لیا کرو یہی میرے آٹوگراف ہیں" محترم پرویز رحمۃ اللہ علیہ اپنے دروس میں کہا کرتے تھے کہ ان حوالوں کو نوٹ کرتے جایئے، ان باتوں کو لکھتے جایئے جو میں بتا رہا ہوں یہ آپ کے کام آئیں گی۔ آج ہمارے زمانے میں ایسے خوش نصیب مل جائیں گے جنہوں نے پرویز صاحب کے درسوں کو Live سنا بھی اور سمجھا اور لکھا بھی اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد وقتاً فوقتاً اپنے بچوں کو اور ملنے جلنے والوں کو فخریہ انداز میں اپنی ڈائریوں اور نوٹ بکس میں لکھے ہوئے درسوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ ہم نے یہ نوٹس Notes آج سے تیس سال یا چالیس سال یا پچاس سال پہلے لکھے تھے۔ قرآن مجید کی بہت ساری خوبیوں میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے نزول کے پہلے دن سے ہی "آج" کے لئے ہے۔ قرآن آسمانی اصول وقوانین کی ایک ایسی لازوال کتاب ہے جو اپنی اشاعت کے روز اول سے ہی زمانہء حال کے لئے ہے، یہ ایک ایسی خوبی ہے جو دنیا کی کسی کتاب کی نہیں ہے۔ پرویز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بتائے ہوئے قرآن فہمی کے طریقے کہ "قرآن کو قرآن ہی سے سمجھئے" کے اصول کے مطابق اگر آپ قرآن کی آیات لکھ کر پڑھنے اور سمجھنے لگیں گے تو آپ کے آج کے لکھے ہوئے نوٹس (Notes) جو آج آپ کے کام آئیں گے تو کل آپ کے بچوں کے کام آئیں گے۔ اس لئے کام آئیں گے کہ قرآن ہر زمانے کے "حال" یعنی Present کے لئے ہے۔ ہمارا دوسرا مشورہ پڑھنے کے ساتھ دیکھنے اور سننے سے متعلق ہے۔ ملکی اور غیر ملکی حالات حاضرہ (Current Affairs) اور International Affairs سے باخبر رہنے کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ اخبارات، رسائل اور مختلف کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ملکی اور غیر ملکی مختلف ٹی وی چینلز دیکھنے اور ایف ایم ریڈیوز کے بہت سارے چینلز بھی سننے ہوں گے۔ نوجوانوں میں مطالعے کی عادت Reading Habit بہت ہی کم ہوگئی ہے، ان کو مطالعے کی عادت ڈالنا ہوگی۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کو بہت تیز کر دیا ہے خاص طور پر مغربی ممالک نے اپنے الیکٹرانک میڈیا کو اتنا تیز رفتار بنا دیا ہے کہ ہمارا ایک عام پاکستانی بھائی ان کی تیز رفتار نشریات میں موجود ان کے نظریات اور مقاصد کو شاید ہی سمجھ سکے۔

ہم نوجوان دوستوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ قرآن کریم کے معیار کے مطابق مومن اور پھر مسلم بننا آسان کام نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں تو مسلمان بننا تو اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ایک چھوٹا اور آسان سا حکم ہے کہ صاف اور سیدھی بات کیا کرو، سچی بات کیا کرو، کسی معاملے میں گواہی دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اللہ کی طرف سے گواہ بن کر سچی گواہی دو، لفظوں کو توڑ مروڑ کر گواہی نہ دو، تمہارا سچ تمہارے اپنے، تمہارے والدین اور اقربین کے خلاف جائے تب بھی تم کو سچ ہی کہنا ہوگا۔ اس ایک حکم کی روشنی میں اپنا محاسبہ کیجیے اور سوچئے کہ ہم سب اپنی روزمرہ کی زندگی میں انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کے فقط اس ایک حکم پر کس حد تک عمل کر رہے ہیں؟

زندگی میں کچھ اچھا کرنے کی تمنا بڑی اچھی بات ہے لیکن اچھا کرنے کے لئے پہلے اچھا بھی تو بننا پڑے گا نا! اتنا اچھا بننا پڑے گا کہ آپ کے کردار کی اچھائیوں کے بارے میں اپنے اور بیگانے سب گواہی دیں کہ ہاں یہ ایک اچھا انسان ہے۔ وہ شخص جو اللہ اور رسول کے احکامات پر عمل نہیں کرتا کفر کرتے ہوئے شہروں میں فساد پھیلاتا ہے، جہاں جاتا ہے' جہاں رہتا ہے' اس جگہ کو جہنم بنا دیتا ہے۔ کافر دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے جبکہ مومن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے' جہاں رہتا ہے' وہ جگہ جنت بن جاتی ہے۔ مومن اپنی جنت اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ اس نور کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے جو قرآن کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ اپنے راستے کو بھی روشن رکھتا ہے اور جو اس کے ساتھ چلنا چاہیں ان کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کی اپنی دنیا میں اسے حیاتِ طیبہ حاصل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے گھر والے اور پڑوسی چین اور سکون سے رہتے ہیں۔ مومن کی شخصیت باغ و بہار ہوتی ہے اپنی ذات میں انجمن ہوتا ہے، لوگ اپنے پاس بٹھا کر اپنے دکھ سکھ اور اپنا حال دل سنانے کے لیے اس کے انتظار میں گویا یہ سوچتے رہتے ہیں کہ:

تو آئے تو لگتا ہے اپنی بھی سحر ہو گی
انداز ہیں سب تیرے سورج کی کرن والے

☆.....☆.....☆

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکُوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر
اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مِینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!

(اقبالؒ)

محمد سلیم اختر خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور پرویزؒ

پرویزؒ صاحب کی تمام کتابوں اور تحریروں کو اگر اقبالیاتِ پرویز کا نام دے دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اقبالؒ کی شاعری پر ان کے لیکچرز تو اور بھی خاصے کی چیز ہیں۔ زبان و بیانِ پرویز اور زیرِ درس اقبالؒ کے اشعار ہوں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ اور پرویزؒ کے موضوع پر خود پرویز صاحب کی تحریروں کے اقتباسات پیش کر دیے جائیں تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ ذیل میں کچھ اقتباسات پیشِ خدمت کئے جا رہے ہیں جو متعدد کتابوں اور مقالوں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں' ان اقتباسات سے ان دونوں عظیم شخصیات کے باہمی تعلقات کا ایک واضح خاکہ سامنے آ جائے گا۔

علامہ اقبالؒ سے پرویزؒ صاحب کا ابتدائی تعارف:

پرویز صاحب نے اپنی تصنیف ''تصوف کی حقیقت'' میں اقبال سے اپنے ابتدائی تعارف کی کہانی کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

> مجھ پر مبداءِ فیض کی ایک اور نگہ تلطف یہ تھی کہ دادا جانؒ بڑے وسیع المشرب اور کشادہ نگاہ واقع ہوئے تھے۔ اس کا مجھے کس طرح فائدہ پہنچا' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ جب علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تو اہلِ تصوف کی طرف سے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا گیا' کیونکہ اس میں مسلکِ وحدت الوجود پر بالعموم اور حافظؔ پر بالخصوص کڑی تنقید کی گئی تھی۔ (اس معرکہ کا تفصیلی ذکر آپ کو متنِ کتاب میں ملے گا)۔ دادا جانؒ خود وحدت الوجودی اور حافظؔ کے مداح تھے۔ اس اعتبار سے انہیں ان کا ساتھ دینا چاہئے تھا جو اقبالؒ کے خلاف ہنگامے برپا کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے' نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی وسعتِ قلب کا ایک اور انداز سے ثبوت دیا۔ انہوں نے مثنوی اسرارِ خودی کو سبقاً سبقاً مجھے خود پڑھایا' اور اس انداز سے کہ حضرت علامہؒ کی علمی عظمت اور احترام میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ یہ اقبالؒ کے ساتھ میرا پہلا قلبی تعارف تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر وہ مجھے مسلکی تعصب کی تنگ نگہی کے ساتھ مثنوی پڑھاتے تو (اس شاخِ سرسبز کی سی عمر میں) میرے قلب کی گہرائیوں میں علامہ اقبالؒ کا کس قسم

کا تصور جاگزیں ہوتا اور میں زندگی کی کتنی بڑی عظیم اور بے بہا متاع سے محروم رہ جاتا! اتنا ہی نہیں! دادا جانؒ نے میری نگاہ کا رُخ کس طرح دانشکدۂ اقبالؒ کی طرف موڑ دیا' اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ساتھ ان کے روابط تھے' یا وہ (کم از کم) باہمد گر متعارف تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ دادا جانؒ نے مثنوی کے جس نسخہ کو مجھے پڑھایا تھا' اس پر حضرت علامہ کے دستخط ثبت تھے۔ بہرحال' حقیقت کچھ بھی ہو' علامہ اقبالؒ کا ابتدائی نقش جو میرے قلب و دماغ پر مرتسم ہوا' اس نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔

لیکن میں نے ابھی تک فطرت کی اس منفرد نوازش کا ذکر نہیں کیا جس نے مجھے وہ کچھ بنا دیا جو کچھ میں اب ہوں۔ یعنی آفتابِ قرآنی کے ساتھ نسبت رکھنے والا ایک ذرۂ خاک۔۔۔ اور اس پر میں جس قدر بھی فخر و ناز کروں' کم ہے۔ وہ نوازشِ خصوصی یہ تھی کہ مجھے تنقیدی نگاہ بھی عطا کر دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں کسی بات کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا جب تک میرا قلب و دماغ مطمئن نہ ہو جائے۔ تنقیدی نگاہ کے نشتر کی خلش کا سلسلہ اسی زمانہ میں شروع ہو گیا اور دلائل طلبی گویا میرا علمی معمول بن گیا تھا۔

(تصوف کی حقیقت' باب رسم و رہ منزلہا' صفحات' غ۔ف)

پرویزؒ صاحب کی علامہ اقبالؒ سے ملاقاتیں:

''جب میں لاہور آنے لگا تو دادا جانؒ نے مجھے (لاہور میں) ''دو بزرگوں'' سے ملنے کی تاکید فرمائی۔ ایک امام الدین نجار جو نواں کوٹ کے گاؤں میں رہتے تھے (اور کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں) اور دوسرے علامہ اقبالؒ جن سے انہوں نے مجھے' ذہنی طور پر پہلے متعارف کرا رکھا تھا۔ اول الذکر بزرگوار سے تو میں ایک آدھ مرتبہ ہی ملا' لیکن حضرت علامہؒ کی خدمت میں بازیابی کے مواقع زیادہ حاصل ہوئے' اب جو اس زمانے میں ان کی خدمت میں حاضری کی جرأت پر نگۂ بازگشت ڈالتا ہوں تو دل ہی دل میں محجوب سا ہو جاتا ہوں۔ کہاں علامہ اقبالؒ اور کہاں ایک اٹھارہ بیس سال کا نووارد' گمنام سا طالب علم! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! لیکن حضرت علامہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی ملنے والے کے دل میں اپنی بلندیٔ مقام کا احساس نہیں پیدا ہونے دیا کرتے تھے۔ وہ بہت جلد اس کے ''یار'' بن جایا کرتے اور یوں بعدِ مرتبت کا احساس مٹا دیا کرتے تھے۔

جہاں تک امورِ شریعت کا تعلق ہے' میں نے حضرت علامہ سے قرآن فہمی کا طریق اخذ کر لیا۔ اس کے بعد میں قرآن اور دین کے سلسلے میں جو کچھ کر سکا ہوں' وہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ مجھ ذرۂ ناچیز پر ان کا یہ اتنا بڑا

احسان ہے جس سے میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔‘‘

(ایضاً۔صفحات‘ق۔ک)

ماہنامہ طلوعِ اسلام‘ قائداعظمؒ اور اقبالؒ:

محمد عمر دراز صاحب ’’مجلسِ اقبال‘‘ کے آغازِ سخن میں چوہدری حبیب الرحمن کی کتاب ’’اقبالؒ قائداعظمؒ پرویزؒ مودودی اور تحریکِ پاکستان‘‘ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:

حضرت قائداعظمؒ نے جب حصولِ پاکستان کے لئے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو انہیں‘ خلافِ توقع ایک ایسے محاذ پر بھی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے اپنے (سیاسی) دائرہ عمل سے باہر تھا۔ یہ مخالفت تھی ان مسلمان نیشنلسٹ علماء کی طرف سے جو ہندو کانگرس کی وظیفہ خوری میں‘ اپنی قوم کی تمام تر متاع‘ ہندو کے ہاتھ بیچ ڈالنے کے درپے تھے۔ قائداعظمؒ نے‘ تحریک پاکستان کی اس محاذ سے مخالفت کے سدباب کی ذمہ داری جناب غلام احمد پرویزؒ کے سپرد کی۔ میاں بشیر احمد صاحب نے بتایا کہ قائداعظمؒ کے اس انتخاب کے محرک علامہ اقبالؒ تھے۔ آپ نے پرویز صاحب کا نام اپنے مذکورہ باہمی تعلقات اور پرویزؒ صاحب کی فہم قرآن سے متعلق اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تجویز کیا تھا۔ چنانچہ قائداعظمؒ کی تفویض کردہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے 1938ء میں ماہنامہ طلوع اسلام کا دہلی سے آغاز نو ہوا۔ اس زمانے کی طلوع اسلام کی فائلیں اس پر شاہد ہیں کہ پرویزؒ صاحب نے کس مہارت اور جانفشانی سے مجوزہ مملکت پاکستان کی دینی اہمیت اور اس کے حصول کی ضرورت کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ حضرت قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کو بارگاہ ایزدی سے شرف پذیرائی ملا اور 14 اگست 1947ء کو نئی مملکت پاکستان دنیا کے نقشہ پر ابھری جبکہ مخالفین پاکستان کے حصہ میں روسیاہی‘ ندامت اور شکست کے سوا اور کچھ نہ آیا۔ پرویزؒ صاحب کی یہ مساعیٔ جمیلہ اب ’’تحریک پاکستان اور پرویز‘‘ نامی کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مزید برآں پرویز صاحب کی تحریک حصول پاکستان کے سلسلہ میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انہیں حکومت کی طرف سے ’’تحریک پاکستان گولڈ میڈل‘‘ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ ہے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے پرویزؒ صاحب کے تعلقات اور تحریک پاکستان میں ان کی قومی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک۔

(مجلسِ اقبال از پرویز‘ صفحات‘ ط۔ظ)

علامہ اقبالؒ سے پرویزؒ صاحب کی آخری ملاقات

اس ملاقات (جنوری 1938ء) کا احوال پرویزؒ صاحب نے خود اپنے قلم سے تفصیلاً تحریر کیا ہے جو کہ ان کی تصنیف

''اقبالؒ اور قرآن'' میں شامل ہے اس موقعہ پر انہوں نے اقبالؒ سے ان کی تصنیف ''جاوید نامہ'' سے متعلق بھی گفتگو کی۔ اس گفتگو کا ایک اقتباس ذیل میں درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحر جن کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون کا دندان شکن جواب ہے' انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہئے تھی۔ فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمدؒ (بریلوی) اور سید احمد (دہلوی)' (سرسید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقع پر ان کو لکھوں گا۔

(اقبال اور قرآن' صفحات 99-98)

''تبویب القرآن'' کی ترتیب میں اقبالؒ کی راہنمائی:

لغات القرآن کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میری زندگی' بچپن سے لے کر اس وقت تک' اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے۔ ابتداءً میں نے بھی (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) اس کا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ

منزل و مقصود قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اس وقت جب میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی سے (من جملہ دیگر امور) یہ اہم نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

''تصریف آیات'' کی رو سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تبویب القرآن کی ضرورت تھی۔ یعنی ایک موضوع سے متعلق' قرآن کریم کی تمام آیات کو یکجا کر کے انہیں مربوط مضمون کی شکل میں مرتب کرنا۔ اگرچہ تبویب القرآن کے متعلق اس سے پہلے بھی کوششیں ہوئی تھیں لیکن جو خاکہ علامہ اقبالؒ کے پیش نظر تھا' اور جس کی تفصیل انہوں نے مجھے بتائی تھی' اس کے مطابق کوئی کتاب مجھے نہ مل سکی۔ اس کے لئے ایک نئی کتاب کی تدوین کی ضرورت تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کوئی جماعت' یا مجھ سے زیادہ موزوں فرد' اس اہم کام کے لئے تیار ہو جائے' لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور بالآخر یہ اہم کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ اس کے لئے

میں نے سینکڑوں عنوانات کے ماتحت قرآنی آیات کی تبویب (Classification) کی۔

(لغات القرآن، پیش لفظ، صفحات 20-19)

مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ:

اس مجلس کا احوال پرویزؒ صاحب کے رفیقِ قدیم خورشید عالم صاحب نے دسمبر 1954ء میں تفصیل سے قلم بند کیا جو کہ ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا:

1951ء میں، مصر کے نامور دانشور، صاحبِ قلم اور کلامِ اقبال کے شیدائی، ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ مملکتِ مصر کے نئے سفیر کی حیثیت میں پاکستان تشریف لائے۔ اس سے پہلے آپ فرانس میں یہ فرائض ادا کر رہے تھے، جہاں انہوں نے اقبالؒ کے ''پیامِ مشرق'' کا منظوم عربی ترجمہ کیا تھا۔ قیام فرانس کے دوران کسی تقریب میں آپ کو کسی نے بتایا کہ اگر آپ کلام اقبال سے کماحقہٗ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو پاکستان جائیے۔ وہاں آپ کو ایک پاکستانی اقبال شناس، کلام اقبال کی حقیقی روح سے روشناس کرائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب، اس وقت کے فرمانروائے مصر، شاہ فاروق سے اپنی خصوصی درخواست پر پاکستان کے لئے سفارت حاصل کر کے یہاں آئے اور سید عبدالواحد صاحب (سیکرٹری مجلس اقبال) کے توسط سے آپ نے پرویزؒ صاحب سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے تو اپنے ذہن میں ایک عجیب سا تصور لے کر۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان وشوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنع، تکلف، ظاہرداری اور دیگر بے شمار بظاہر حسین لیکن بباطن خبیث دخترانِ ماڈرن ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو ''سود وسودائے مکر وفن'' سے معمور ہے، نہ کہ ''سوز ومستیٔ جذب وشوق'' سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا ذکر کہاں جن کے قلوب واذہان میں ''قرآن اور اقبال'' نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ، سکونِ گہر بھی ہو، جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو کہ:

ز برونِ در گذشتم، ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے، اس حال میں کہ آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ سفیرِ مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے یہ محسوس کیا کہ وہ کارِ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں۔ وہ درویشِ خدامست، نہ شرقی ہے نہ

غربی۔ایک طرف ان کا علم وفضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔اس میں سراسر طالب علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز وگداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہوسکتا تھا۔اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے ''من تو شُدم' تو من شُدی'' کی حقیقی الف بین قلوبکم کی تصویر بن جاتے ہیں۔ یہ ملاقات مجلسِ قلندرانِ اقبال کا نقش اول بنی۔ چنانچہ مجلسِ قلندرانِ اقبال کی تاسیس ہوئی اور سفارت خانہ مصر میں اس کی نشستوں میں ضربِ کلیم' بالِ جبریل' ارمغانِ حجاز (حصہ اردو)۔ جاوید نامہ' اسرار ورموز' پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور بانگِ درا لفظاً لفظاً پڑھی گئیں اور ان کی تشریح کی گئی۔سفیرِ اقبال ڈاکٹر عزام نے ان شرحوں کو منظوم عربی کا پیرہن دیا اور پوری دنیائے عرب کو فکر اقبال کے نور سے منور کر دیا۔انہوں نے علامہ اقبال کے عرب دنیا میں تعارف کی غرض سے ایک خود مکتفی کتاب بعنوان ''محمد اقبال۔سیرتہ' شعرہ' وفلسفتہ' بھی تالیف کی۔

ان مجالس میں ظاہر ہے کہ شیخِ قلندراں کا منصب پرویز صاحب ہی کے لئے مختص تھا کیونکہ کلامِ اقبال وہی پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ کا تعارف بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے پرویز صاحب ہی سے لکھوایا' جواب (ترجمہ اردو) پرویز صاحب کی تصنیف ''اقبال اور قرآن'' جلد اول میں شامل ہے۔

یہ سلسلہ 4 سال تک جاری رہا اور اس مجلس کی آخری نشست 11 دسمبر 1954ء کو منعقد ہوئی جس میں مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' کا آخری باب زیر مطالعہ رہا۔اس کے بعد سفیر اقبال' پاکستان سے رخصت ہوکر سعودی عرب چلے گئے۔

1955ء میں بعض احباب کی طرف سے تقاضے موصول ہونا شروع ہوئے کہ طلوع اسلام میں پیغامِ اقبال کو عمومی طور پر پیش کرنے کے علاوہ' اس میں کلام اقبال کی تشریح مسلسل اور التزاماً شائع ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے مثنوی اسرار ورموز کا انتخاب کیا گیا کہ حضرت علامہ کی پہلی مطبوعہ کتاب بھی یہی تھی۔1955ء سے 1959ء تک اس مثنوی کی شرح طلوع اسلام میں شائع ہوتی رہی' جو اب کتابی شکل میں شائع کی جا چکی ہے۔(خورشید عالم' ماہنامہ طلوع اسلام' دسمبر 1954ء)

اقبالؒ اور نقدِ پرویزؒ

اس سب کے باوجود پرویز صاحب نے جہاں جہاں اقبال کے افکار کو اپنی رائے میں قرآن کے مطابق نہیں پایا' نہایت غیر جانب داری سے تنقید کی ہے۔وہ خود تصوف کی حقیقت میں تحریر فرماتے ہیں:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

''اپنوں کی خفگی'' کی وجہ میری وہ تنقید ہوگی جو میں نے خود علامہ اقبالؒ کے بعض عقائد اور خیالات پر کی ہے۔ اقبالیئین کا حلقہ تو میرے اپنوں کا حلقہ ہے۔ ان میں اکثریت ان کی ہے جو خود میری تحریروں کی وجہ سے فکرِ اقبالؒ کے قریب آئے ہیں۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح اس کتاب کے حصۂ دوم میں ملے گی جو 'اقبالؒ اور تصوف'' سے متعلق ہے)۔

جہاں تک مخالفت کا تعلق ہے میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تنقید اصولوں پر مبنی ہے۔ اس سے کسی واجب الاحترام شخصیت کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں۔ میں تو (قرآن کی رو سے) غیر مذاہب کے مذہبی بزرگوں کی تحقیر بھی روا نہیں رکھ سکتا چہ جائیکہ خود اپنے ہاں کے بزرگوں کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کا مرتکب ہوں۔ کسی کی غلط بات کو غلط کہنے کو اس کے خلاف گستاخی پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں تو اس اسوۂ ابراہیمیؑ کے اتباع کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے جس کی رو سے اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا (19:42) انہوں نے اپنے والد تک کو معبودانِ باطل کی عبودیت سے روک اور ٹوک دیا تھا لیکن اس کے باوجود اسی والد کے ساتھ حسن سلوک کے جذبہ میں فرق نہیں آیا تھا۔ یہ اسی جذبہ کا تقاضا تھا جو وہ دعا کرتے رہے کہ اسے (والد کو) صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق عطا ہو جائے (القرآن۔ 114:9) اپنی ملت کے بزرگوں کے متعلق میرا مسلک بھی یہی ہے۔ میری تنقید ان کے غیر قرآنی عقائد کے خلاف ہے' ان کی ذات کے خلاف نہیں۔

تحریک پاکستان گولڈ میڈل

شعبہ تحریک پاکستان' محکمہ اطلاعات وثقافت' حکومتِ پنجاب کی جانب سے کارکنانِ تحریکِ پاکستان کی لائق تقلید وصد تحسین خدمات کے تذکار جمیلہ پر مشتمل ایک کتاب شائع کی گئی جس کی مجلس ادارت میں پروفیسر محمد مظفر مرزا' شہباز بخت اور اشفاق ملک شامل تھے۔ اس کتاب میں پرویزؒ صاحب کا تعارف اس طرح درج ہے:

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش 9/ جولائی 1903ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور 1955ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائی ءاقبالؒ ہونے کے ناطے' آپ 1930ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

1937ء کے موسم گرما میں' علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیامِ شملہ کے دوران

علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کئے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء' مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا' اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے' اس لئے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لئے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے' مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزمِ اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب 1946ء میں سرخ پوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں' پاکستان میں شمولیت/عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزارت اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز 38-1937ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ کے' تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظمؒ سے پیشگی وقت لئے بغیر ان کی خدمت میں' کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا۔ پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی' پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اس کا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لئے مناسب افسروں کے انتخاب کے لئے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مردِ مجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپردِ قلم کئے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔

(تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل، حصہ دوم، صفحات 34-33)

اقبالؒ کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں:

جناب ڈاکٹر سید نذیر نیازی نے ''اقبالؒ کے حضور میں ''نشستیں اور گفتگوئیں'' کے عنوان سے ایک بیاض یادداشت ترتیب دی تھی جس کا جزو اول یکم جنوری 1938ء اختتام 21 مارچ 1938ء پر ہوتا ہے۔ جزوِ دوم 22 مارچ سے 21 اپریل تک ہے۔ اس کتاب میں صفحہ 36 پر دوشنبہ 10 جنوری کے عنوان سے دہلی سے آنے والے اس قافلہ قلندرانِ اقبال کا ذکر ہے جو مولانا اسلم جیراجپوری کی قیادت میں 9 جنوری کو یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کے لئے لاہور آیا تھا۔ جو انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ نے منایا تھا۔ جس میں جناب پرویز نے ایک نہایت خیال انگیز، فکر ریز اور احساس خیز تقریر دلنشیں انداز میں ارشاد فرمائی تھی۔ اس موقعہ پر اقبال سے ملاقات کا احوال سید نذیر نیازی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ جس کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

سید نذیر نیازی رقم طراز ہیں:

''پرویز صاحب شاید اس وقت سے جب حضرت علامہ (اقبال) نے کانگریس کے طرفدار علماء کی کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کیا تھا، موقعہ کے منتظر تھے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام کی تفسیر قرآن کا ذکر چھیڑ دیا اور ظاہر ہے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے بارے میں گفتگو ہوتی تو مولانا کا ذکر ضرور آتا۔ ان کی تفسیر اگرچہ برسوں کے انتظار کے بعد شائع ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ توقعات پوری نہ ہوسکیں جو مولانا کے علم و فضل سے وابستہ تھیں بالخصوص اس لئے کہ ''الاسلام بمقابلہ اسلام اور ''الدین'' بہ مقابلہ دین کی اصطلاحیں وضع کرتے ہوئے انہوں نے اسلام کی تعبیر ایک ایسے رنگ میں کی جس سے بجائے ایک واضح، قطعی اور محکم دستور حیات کے دین کی حیثیت محض ایک عقیدے، ایک نظریئے، ایک مجرد فکر اور ایک احساس کی رہ گئی۔ مولانا کے نزدیک قرآن پاک کی دعوت یہ ہے کہ جملہ مذاہب عالم ایک دوسرے کی سچائی کا اعتراف کریں۔ سب اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیمات پر کاربند رہیں تاکہ وہ سب گروہ بندیاں جو ''شرع و منہاج کے اختلاف نے پیدا کر رکھی ہیں، کالعدم ہو جائیں اور دنیا سمجھ لے کہ ''الدین'' یا ''الاسلام'' کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ یہ مقصد ہے خدا پرستی اور نیک عملی۔ اس لئے کہ نجات و سعادت کی اساس ہے حسن اعتماد کے ساتھ ساتھ توحید

باری تعالیٰ کا اقرار۔

پرویز صاحب نے کہا وحدتِ ادیان کا یہی غلط تصور، جو مولانا نے اس طرح قائم کیا سرچشمہ ہے قرآن مجید کی اس تفسیر کا جو مولانا نے فرمائی اور جس سے برہمو سماج کے نقطۂ نظر، ہی کی تائید ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی دینی عصبیت کو تو کوئی تقویت نہیں پہنچتی۔ مولانا کے ارشادات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اسلام اور غیر اسلام میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہتا۔ نہ عقیدۃً نہ عملاً۔ معلوم ہوتا ہے، ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ مذہباً کانگریس کی حمایت کا جواز پیدا کیا جائے تاکہ ہم اپنے اس دعوے سے کہ مسلمانوں کی ایک جداگانہ قومیت ہے دست بردار ہو جائیں۔ مولانا کے عقائد، مولانا کے خیالات اور مولانا کے نظریات میں یہ تبدیلی افسوسناک بھی ہے اور تعجب انگیز بھی۔

پرویز صاحب نے کہا مولانا گویا دبی زبان سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ قوم کا معاملہ مذہب سے الگ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا کی تفسیر شائع ہوئی تو رسالہ معارف میں ان کے قلم سے ایک طویل تبصرہ بھی شائع ہوا تھا (یعنی پرویز صاحب کے قلم سے)۔

حضرت علامہ (اقبال) نے فرمایا ''مدیر معارف'' نے بھی کیا اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر کی؟

پرویز صاحب نے کہا شروع میں تو سید صاحب نے اس تبصرے کی بڑی تعریف کی اور ان خطرات کا اقرار بھی کیا جن کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا تھا لیکن تبصرے کی دوسری قسط کا وقت آیا تو انہوں نے دفعتہ اپنی رائے بدل دی۔

''کیوں؟''

اس عذر میں کہ مولانا کی فضیلت علم اور بصیرت فی الدین مسلّم ہے۔ وہ بہت بڑے سیاسی اور دینی رہنما ہیں۔ ان کے خیالات پر گرفت کی گئی تو بہت ممکن ہے اور زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں۔ مصلحت یہی ہے کہ سردست خاموشی اختیار کی جائے۔ مولانا کا شائد وہ مطلب بھی نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔

ارشاد ہوا۔ ''یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ کسی شخص کا علم و فضل یا احترام ذات ہمیں حق گوئی سے باز رکھے۔ اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔''

چند منٹ خاموشی رہی۔ شاید مولانا کی تبدیلیٔ خیالات پر دل افسردگی کے باعث۔''

☆.....☆.....☆

مُقصودِ اقبالؒ

اسد ملتانی

(یہ اشعار مجلس مرکزیہ یوم اقبالؒ لاہور کے منعقد کردہ ''یوم اقبال'' مورخہ 10 اپریل 1939ء کے لئے لکھے گئے۔ یہ محض تخیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے واقعہ کو شاعرانہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اقبالؒ کے جس ہم نشین کا ذکر آیا ہے اس سے مراد خود علامہ پرویز علیہ الرحمہ ہی ہیں۔ سلیم)

کہا اقبالؒ سے اک ہمنشیں نے
سخن تیرا شرابِ آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دیے دِل
کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی
کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے
کلامِ شاعراں پروردۂ عصر
مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے
اثر میں ہے یہ صُورِ محشر انگیز
کشش میں نغمۂ خُلد بریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا
دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُن کر حضرتِ اقبالؒ بولے
فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا
فلک وہ ڈھونڈ جس کی یہ زمیں ہے
مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز
ادب پروردۂ روحُ الامیں ہے
فروغِ عشق و سوزِ آرزو سے
سخن میرا تب و تاب آفریں ہے
مگر میرے سخن کی روشنی بھی
''چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے''
میرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا
اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف
مری نظروں میں قرآنِ مُبین ہے
گذر جانا مری بزم سخن سے
رہِ قرآں میں گامِ اولیں ہے
جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے
تو حاصلِ دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

ایم۔ایس۔ناز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

غلام احمد پرویزؒ سے علامہ اقبالؒ کے متعلق خصوصی انٹرویو

س: علامہ اقبال سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ صحبتیں جو گزر گئیں، ان کی یاد تازہ کیجئے۔

ج: پہلی ملاقات کے متعلق تو متعین طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کہاں ہوئی؟ اس لئے کہ وہ تو پچاس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہے، آخری ملاقات البتہ ان سے جنوری 1938ء میں ہوئی، جب یوم اقبال، کی تقریب کے سلسلے میں دہلی سے ہمارا قافلہ لاہور آیا اور ان سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں یوں کہئے کہ وہ گویا بستر مرگ پر ہی تھے۔ بینائی بھی بہت کمزور تھی، بولنے میں ان کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے خاصا وقت ہمیں دیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کچھ میری رعایت برتی، اس لئے کہ ہمارے صاحب کارواں علامہ اسلم جیراجپوری علیہ الرحمہ تھے، ان کے اکرام و احسان کی بدولت ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہوگئی۔ خاصا وقت اس میں صرف ہوا اور یہ آخری ملاقات ہے جو حضرت علامہ علیہ الرحمہ سے ہوئی۔ باقی رہے تاثرات، تو محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال کے حضور میں'' اس دن کی صحبت کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان سے کس قسم کے سوال.....؟

سوال تو میں نہیں کہہ سکتا، میری حیثیت تو ان کے سامنے ایک ادنیٰ سے متعلم کی رہی، ہم تو استفادہ ہی کرتے تھے، جرأت کر لیتے تھے کچھ پوچھنے کی، اگرچہ وہ بہت جرأت دلایا کرتے تھے، حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، ان کا تو انداز ہی ایسا تھا، وہ کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہیں اور ان کے سامنے کچھ چھوٹے لوگ بیٹھے ہیں، وہ تو سب کو برابر کی حیثیت دیتے تھے اور بعض اوقات تو انکسار اور بھی بڑھ جاتا تھا، جو ہم لوگوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتا تھا۔

س: پرویز صاحب! اقبال کے حضور میں اس وقت کوئی ایسا موضوع بھی زیر بحث آیا ہو، جس کا ذکر نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب میں نہ کیا ہو؟

ج: میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال اس میں آ گیا ہے یا نہیں، لیکن دو باتیں بڑی اہم ہیں، حضرت علامہ نے 'جاوید نامہ' میں مختلف ارواح یا مختلف ہستیوں سے عالم بالا میں ملاقات کی جو روئداد بیان کی ہے، میرے نزدیک حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ اور ان کا معرکہ بالاکوٹ، ہمارے اس آخری دور کی اسلامی تاریخ میں بڑا پر عظمت ہے، سو میں نے اس موقعہ پر حضرت علامہ سے عرض کیا کہ جی چاہتا تھا کہ آپ سر سید اور سید احمد شہید، دونوں کی ارواح کو آمنے سامنے لا کر ذرا اس کا تقابل

بتاتے۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ اور اس قسم کے اور کئی سوال تھے جو بعد میں میرے ذہن میں آئے اور ایسا ہو جاتا ہے' اب جب بھی مجھے فرصت ملی میں ان چیزوں کو ضرور سامنے لاؤں گا''۔

اور ایک سوال' میں نے یہ عرض کیا کہ یہ جو قیامت کا واقعہ یا حقیقت ہے وہ ہمارے ذہن میں تو ہے کہ ہم انسان ایک دن اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں گے' لیکن قرآن میں تو ہے کہ تیرا خدا اور اس کے ملائکہ یہاں آئیں گے تو کیا یہ سارا ماجرا یہاں ہی ہوگا؟

انہوں نے کہا کہ حیات بعد ممات اور وہاں کے جتنے بھی نظریات ہیں' ان سب کے متعلق میرے ذہن میں ہے اور میں قرآن کریم کی تفسیر کی (introduction) میں اس سوال کو موضوع سخن بناؤں گا۔

س: حضرت علامہ کی صحبت میں جوان کے شیدائی بیٹھتے تھے' وہ کس قسم کے سوال کرتے تھے؟

ج: (مسکراتے ہوئے) یہ شیدائیوں کی بھی مختلف نوعیتیں اور قسمیں ہیں' آپ کا استفسار ہے کہ ان کے ہاں کس قسم کے لوگ بیٹھتے تھے؟ ان کی کیفیت تو بڑی دلچسپ ہے۔ حضرت علامہ چونکہ ڈاکٹر مشہور تھے۔ تو ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ میرے پیٹ کا درد بڑا پرانا ہے' کسی حکیم یا ڈاکٹر سے فائدہ نہیں ہوا' آپ مجھے کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیجئے۔

(قہقہہ لگاتے ہوئے) تو صاحب حضرت علامہ تو یہ بھی بتا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ موچی دروازے کا ایک جفت ساز ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہمارا کاروبار پہلے خوب چلتا تھا' مگر جب سے انگریزی جوتے مارکیٹ میں آ گئے ہیں' ہمارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے' کسی نے ہمیں بتایا کہ علامہ صاحب بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں' سو میں آپ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

غرض کہ یہاں سے لے کر یورپ کے بڑے بڑے بلند پایہ مفکروں تک حضرت علامہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی سطح' افتادِ طبیعت اور مزاج کے مطابق سوال کرتا تھا اور اس کو اس کے مطابق ہی جواب ملتا تھا۔ ادیب' شعراء' فلاسفر اور خود مولوی صاحبان (مسکراتے ہوئے) پیر پرست لوگ بھی۔ کئی ایسے بھی تھے جو آ کر کہا کرتے تھے کہ حضرت کسی طرح سے آپ ڈاڑھی رکھ لیں' تو پھر دیکھیں کہ دنیا کیسے آپ کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ شیدائیوں اور سوالات کی تو یہ کیفیت ان کی محفل میں ہوتی تھی۔

س: بعض لوگ حضرت علامہ کو ڈاڑھی رکھنے کا مشورہ دیتے تھے' لیکن حضرت علامہ نے ایسا نہیں کیا!

ج: علامہ اقبال ان سے کہا کرتے تھے کہ بھئی اس وقت تک عام تاثر یہ ہے کہ دین کے متعلق وہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے یا جان سکتا ہے' جس کی ایک خاص شبیہہ ہو' خاص وضع قطع ہو' اور یہ ہمارا جو نیا طبقہ' نئی نسل یا نوجوان طالب علم ہیں ان کے دلوں میں یہ (Complex) سا پیدا ہو گیا ہے' میں اس (Complex) کو دور کرنا چاہتا ہوں' کہ نہیں' تم بھی دین کو سمجھ سکتے ہو' تمہیں بھی دین کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بطور ایک مثال کے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے میری وضع قطع ایسی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تم جانتے ہو کہ مجھے دین کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے' یہ دنیا کہتی ہے

اور علماء کرام بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں' پس اس (Complex) کو نکال دو کہ جب تک تمہاری ایک خاص وضع قطع نہ ہو گی تم دین کا علم حاصل نہیں کر سکو گے یا دین کے متعلق کچھ نہیں جان سکو گے۔

س: اقبال کے افکار کی وسعت' ان کی بلندی اور ان کی گہرائی بے پایاں ہے۔ آپ نے علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو زیادہ نمایاں طور پر محسوس کیا؟

ج: میں قرآن کا طالب علم ہوں اور قرآن ہی کی کشش سے میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ کہا اس کا میرے دل پہ بڑا اثر تھا اور اثر یہ ہے کہ قرآن کریم کا سمجھنا میں نے حضرت علامہ سے سیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو تھا جو مجھے ان کے قریب لے آیا۔ انہوں نے اپنی پہلی تصنیف ''اسرار خودی'' یا ''رموز بیخودی'' کے آخر میں کہا ہے کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے' اپنی بصیرت کے مطابق قرآن ہی سے سمجھا ہے۔ قرآن کریم کی عظمت اور اس کا احترام میرے دل میں بھی چونکہ بدرجہ نہایت تھا' اس لئے میں جو ان کے قریب ہوا' تو اس کی یہی وجہ تھی۔ باقی چیزیں وہ قرآن کے تابع رکھتے تھے مثلاً دنیا بھر کے علوم پر ان کی نگاہ تھی' لیکن کسی علم یا مذہب کے متعلق جو بحث بھی وہ چھیڑتے' آخر میں وہ قرآن کی طرف آ جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ قرآن اس کے متعلق یوں کہتا ہے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور جاذب پہلو ان کی یہ بصیرت قرآنی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شخصیت کو سمٹایا جائے' تو ان کے افکار کی وسعت' ان کی بلندی اور ان کی گہرائی' سب کچھ اس میں سمٹ کر آ جاتا ہے۔

س: علامہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے' ان کے نزدیک اس مثالی معاشرے کے خدوخال کیا تھے؟

ج: ہاں' یہ وہ سوال ہے جس میں حضرت علامہ کا سارا پیغام سمٹ کر آ جاتا ہے۔ درحقیقت قرآن سے پہلے پوری دنیا میں مذہب کے متعلق تاثر' خیال اور عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی تعلق (Private Affair) کا نام ہے جو پوجا پاٹھ' پرستش' بندگی اور عبادت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے یا مراقبوں اور ریاضتوں کے توسل سے' دنیاوی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں' مگر قرآن حکیم نے آ کر اس کی تردید کی اور بتایا کہ نہیں' ایسا ہرگز نہیں' ضمناً مذہب کا لفظ تو قرآن میں ہے ہی نہیں' اس میں دین کا لفظ ہے' ہماری یہ بدبختی ہے کہ قرآن حکیم یا عربی زبان کے یہ جو الفاظ ہیں' ان کے مترادفات دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہیں' جب ہم ان کا ترجمہ کرتے ہیں تو ان زبانوں میں جو (Concepts) یا تصورات ہوتے ہیں وہیں سے ہم یہ الفاظ لیتے ہیں' اس لئے ہم نے دین کا مترادف مذہب (Religion) لیا۔ جو صحیح نہیں ہے۔ قرآن یا اسلام درحقیقت مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ حضرت علامہ بھی جو کتاب لکھنا چاہتے تھے اور جس کے لئے وہ (Notes) چھوڑ گئے' انہوں نے ایک فقرے میں یہ کہا ہے کہ:

''اسلام (Religion) کے خلاف (Protest) ہے''

صد حیف کہ اقبال وہ کتاب لکھ نہ سکے۔ میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ میں نے ان کے موضوع کو اپنایا' بہرکیف

یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ میں نے Islam, A Challenge to Religion لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام مذہب کے خلاف ایک چیلنج تھا۔ مذہب کا جو تصور (Concept) رہا ہے کہ دنیوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں، قرآن نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ بنابریں وحی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور کو ابدی اقدار کے تابع رکھ کر حل کرے۔ حضرت علامہ نے اسے ایک مصرعہ میں یوں سمو دیا ہے کہ ؎

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولا جا سکتا ہے اور یہی ہے دین اسلام کا کام، قرآن نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ اب جہاں تک دنیوی امور کا تعلق ہے، ان میں مملکت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دنیوی امور دراصل مملکت ہی کے ذریعے طے پاتے ہیں، گویا اسلام وہ ہے جس میں مملکت اقدار خداوندی کے تابع رہ کر دنیوی معاملات کا حل پیش کرتی ہے اس میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں رہتے بلکہ ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے لکھا ہے:

''میں تو یہ کہوں گا اور تمہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ: یہ ایک حقیقت کے دو رخ ہیں''۔

مقصود حضرت علامہ کے کہنے کا یہ تھا کہ دو رخ ہونے میں بھی کچھ ثنویت (Dualism) کا تاثر آ جاتا ہے اس لئے کہ ؎

گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں عرض کروں گا کہ جب اسلام میں ملوکیت در آئی تو اس نے آ کر پھر یہ ثنویت پیدا کر دی۔ مملکت، سلطنت اور دنیا کے معاملات حکومت نے اپنے پاس رکھ کر ایک الگ دائرہ قائم کر لیا۔ مذہب کے معاملات انہوں نے علماء کو دے دیئے، اس طرح سے دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں قائم ہو گئیں، جنہوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اس طریق کار سے وہ تصور ابھر آیا، جو اسلام سے پہلے رائج تھا اور جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ہمارے ہاں ہزار برس سے یہی تصور چلا آ رہا تھا، ثنویت چونکہ حکومت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کے لئے مفید تھی، اس میں دونوں کو الگ الگ اقتدار کے دوائر حاصل تھے، اس لئے حکومت نے تو اس کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا ہی تھا، مذہب پرست طبقے نے بھی ہمارے ہاں ان گروہوں کو اور زیادہ مضبوط کیا، چنانچہ کیفیت یہ ہو گئی کہ اذہان نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مملکت اور مذہب یکجا ہو سکتے ہیں، حضرت علامہ کا یہ زندہ جاوید کارنامہ تھا کہ انہوں نے فرمایا ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حضرت علامہ واشگاف انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے اسلام ایک نظام زندگی ہے، ایک ضابطہ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو مستنیر کرتا ہے۔ عبادت، مناصب اور امور مملکت کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ اسی صورت میں زندہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ایک آزاد مملکت ہو۔

س: حضرت علامہؒ کے ذہن میں کس قسم کے مستقل نظام کا نقشہ تھا؟

ج: وہ ابدی حقائق، اصول یا اقدار، جو خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے، وہی مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ حضرت علامہ نے یہ تصور دیا تھا کہ آپ ان مستقل اقدار کو بطور حدود کے لیجئے، یہ غیر متبدل رہیں گی۔ ان حدود کے اندر رہ کر بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین یا اس کے جزوی پروگرام کی جزئیات، ہر دور کی امت باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گی، اس طرح سے یہ غیر متبدل اور تغیر کے امتزاج سے زمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ زمانے کی امامت کرتا ہوا نظام آگے بڑھے گا۔ مستقل نظام کی یہ ایک شکل ان کے ذہن میں تھی۔ اقبال، قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب سمجھتے تھے، ان کا ایمان تھا کہ اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن قیامت تک امت کی ہر سیاست، مملکت اور امور دنیا کا ایک دستور اساسی رہے گا، اس اعتبار سے یہ ایک مستقل نظام ہوا، لیکن جو اس کی جزئیات ہیں، وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر مستقل اور تغیر پذیر عناصر کے امتزاج سے یہ نظام بنتا ہے۔ مستقل نظام کا یہی نقشہ حضرت علامہ کے ذہن میں تھا۔ یہ تصور انہوں نے قرآن سے لیا اور یہی قابل عمل تصور تھا۔ اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت ہو، جس میں اس نظام کو نافذ کریں اور اس کی جزئیات کو ممکن العمل بنائیں، اور اس کے جو انسانیت ساز نتائج ظہور پذیر ہوں، انہیں دیکھ کر پہلے مسلمان مملکتیں غالباً اور اس کے بعد دنیا کی دوسری اقوام بھی اس کی طرف لپک کر آ جائیں گی۔

س: اقبالؒ کے ذہن میں اسلامی نظام کا کیا تصور تھا؟

ج: اس زمانہ میں سب سے بڑا اعتراض یہ پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے ہیں جن کی موجودگی میں ایک اسلامی مملکت، ایک اسلامی نظام یا ایک اسلامی دستور پر متفق ہونا کیسے ممکن ہے؟ علامہ اقبال اس کے جواب میں فرماتے تھے:

''ٹھیک ہے، فرقوں کی موجودگی میں جانتا ہوں، لیکن ان سب کے اندر قرآن ایک قدر مشترک ہے؟ اگر ان کی اساس قرآن ہوگی، تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا''۔

''فکری روابط کی بڑی اہمیت ہے، ان حضرات (ائمہ کرام، جنہوں نے فقہ مرتب کی) نے اپنے اپنے وقت میں بڑا کام کیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں، لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بال آخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں، اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے''۔

حضرت علامہؒ کہتے تھے کہ یہ پچھلے حالات تھے، مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے، جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ:

''خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ۔۔۔''۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں:

''ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے

رہنمائی لے سکتی ہے‘ لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔‘‘

حضرت علامہ اقبالؒ کے چھٹے خطبے میں‘ جس کا ایک اقتباس میں نے سنایا ہے‘ اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہی وہ عملی طریق یا پروگرام ہے‘ جس کی رو سے وہ اس سرزمین کو اسلامی نظام کا گہوارہ دیکھنے کے متمنی تھے۔

س: اقبال نے جس جہانِ نو کا خواب دیکھا تھا۔ کیا ہم اس کے مطابق صحیح رخ پر آگے بڑھے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ج: پیش رفت تو درکنار‘ ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ 1930ء میں جب حضرت علامہ نے یہ تصور پیش کیا تو کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی تھی۔ 1938ء سے 1940ء تک قائداعظم جب اس تصور کو لے کر آگے بڑھے تو بیم ورجا کا عالم تھا‘ اس زمانے میں مخالفت کچھ سطحی سی تھی اس کے بعد جب یہ تصور عملی صورت اختیار کرنے لگا تو مخالفت نظریاتی ہوتی چلی گئی اور اس میں تندی و تیزی اور تلخی بھی آتی چلی گئی۔ بالآخر پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مملکت کیا تھی؟ یہ تصور کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل‘ یہ تصور اور یہ مملکت ثنویت کو مٹانے کے لئے تھی۔ پاکستان میں اقبال کے تصور کا اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہوسکتا تھا کہ یہ ثنویت باقی نہ رہتی۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکمرانی کا حق نہیں دیتا‘ اقتدار کی کوئی بھی شکل ہو‘ اسلام انسانوں پر اقتدار کو ختم کر دیتا ہے۔

اگر پاکستان میں اقبال کے تصور کی مملکت معرض وجود میں آ جاتی تو مذہبی پیشوائیت کی یہاں کوئی گنجائش نہ رہتی‘ حکمران طبقے نے اپنے دور کے سیکولر نظام یہاں رائج کئے۔ نام تو سارے اسلام کا لیتے رہے‘ کیونکہ اسلام کے نام پر دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی 1930ء سے جنگ لڑی تھی‘ اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام کا نام لئے بغیر اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ درمیان میں کہیں ’’میں‘‘ آ جائے‘ جس سے میں ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں‘ میں طبعاً کچھ ایسا واقع ہوا ہوں‘ لیکن بعض دفعہ؟ ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

افسوس‘ اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا‘ وہ پورا نہ ہوسکا۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ اقبال نے وہی کچھ کہا جو قرآن نے کہا ہے اور ہمارا تو ایمان ہے کہ اس نظام (اسلام) نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ اگر ہم شروع ہی سے نوجوان طبقے بالخصوص طلباء کے نصاب ہی سے اقبال کو لازم کر دیتے تو آج ہمیں قنوطیت کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ اب بھی اگر یہ انتظام ہو جائے تو اقبال کا تصور نئی نسل کے رگ و ریشے میں سما سکتا ہے۔ میں تو اقبال کے اس تصور کو‘ اس پیغام کو عام کرتا رہوں گا‘ یہ میرے ایمان کا جزو ہے‘ یہ میرے دین کا فریضہ ہے۔ آخر میں‘ میں عرض کروں گا کہ علی گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی‘ تو پاکستان کی مملکت معرض وجود میں آ گئی‘ اگر یہاں بھی ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جائے اور اقبال کے تصور کو نصاب کا حصہ بنا دیا

جائے‘ تو اقبال نے جس جہانِ نو کا خواب دیکھا تھا‘ وہ شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ (ہاں)۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا:

’’زود یا بدیر یہ سوال مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی‘ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے‘ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے‘‘۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اقبال کے پیغام اور ان کی فکر کو عام کرنے کے لئے ہم کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟ اور اگر نہیں بڑھے تو کس سمت کو جا رہے ہیں۔ درحقیقت مخالفینِ اقبالؒ کی خواہش ہے کہ ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اس دور میں جس کو شرعِ پیغمبری یا نظامِ اسلامی کہا جاسکتا ہے وہ تو اقبال کے تصور سے پیدا ہوتا ہے‘ (اور اب) ہم آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت جس کا دائرہ ابتداء میں مذہب تک محدود تھا اب سیاست میں بھی در آیا ہے‘ حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھے‘ بلکہ بہت پیچھے چلے گئے ہیں‘ اور ہماری یہ کیفیت تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں ہوئی کہ مذہب پرست طبقہ سیاست کے اوپر آ کر حاوی ہوجائے۔

س: کیا یہ بات نہیں کہ اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہا‘ جو مذہب سے بیگانہ تھے اور صرف سیاست جانتے تھے؟ اس لئے اگر یہ تجربہ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

ج: مگر میری ذاتی رائے میں اگر انتخابات میں ایسا ہوا‘ تو ہوسکتا ہے‘ مذہبی طبقہ اس فکر میں ہے کہ اقبالؒ کی فکر آگے نہ آئے۔ حکمران طبقوں کے مفاد میں بھی یہ بات ہے کہ سیکولر نظام ہی رہے۔ سرمایہ دار طبقہ کی بھی یہی خواہش ہے‘ کیونکہ یہ ان کے مفاد میں ہے‘ اقبال اور قرآن سرمایہ داری کے مخالف ہیں۔ (یہ سب گروہ) فکرِ اقبال کے مخالف ہیں کیونکہ یہ طبقے نہیں چاہتے کہ یہاں سلامی نظام رائج ہوجائے۔

س: تو پھر اقبال کی فکر کو عام کون کرے گا؟

ج: جس کو جرأت نصیب ہوگی‘ وہی اقبال کی فکر کو عام کرے گا۔ ایسی جرأت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بخشی تھی‘ بقول اقبال:

’’وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے‘‘۔

جرأت کے فقدان کے بغیر اقبال کا تصور یا پیغام عام نہیں ہوسکتا۔ جرأت کے بغیر یہ تصور‘ یہ پیغام یا تو شاعری ہوجائے گا یا پھر قوالوں کی ڈھولک پر گایا جائے گا۔

(بشکریہ فکر و نظر‘ اسلام آباد‘ نومبر‘ دسمبر 1977ء)

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جلوۂ سروش، نوائے سروش اور حرکت بہ وادیٔ یرغمید

آج جولائی 1968ء کی 17 تاریخ ہے اور مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ حسبِ معمول اپنی ہفتہ وار نشست میں بدھ کی شام 25-B گلبرگ لاہور میں جلوہ بار ہے۔ ''جاوید نامہ'' ہمارے سامنے ہے۔

سروش اور عقل کی پیدائش کے متعلق زرتشتیوں اور یونانیوں کا اختلاف

اقبالؒ، رومی کی قیادت میں عارفِ ہندی سے مصروفِ گفتگو تھا' بلکہ یوں کہیے کہ عارفِ ہندی انہیں ہندی فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ وہ موضوع ہم نے ختم کر لیا تھا چونکہ اس میں گفتگو کو DRAMATIC TOUCH (ڈرامائی رنگ) دینا ہوتا ہے اس لیے ایک THEME (موضوع) سے دوسرے THEME (موضوع) میں آنے کے لیے' درمیان میں اس قسم کی چیز لاتا ہے۔ دوران بیان ''جلوۂ سروش'' ہُوا یعنی ''سروش جلوہ بار'' (غیبی فرشتے کا ظہور) ہوا۔ زرتشتیوں کے عقیدے کی رو سے ''سروش'' وہ فرشتہ ہے جو خدا کا پیغام رسولوں کو پہنچاتا ہے یعنی جسے ہم جبریل کہتے ہیں' ان کے ہاں اسے سروش کہا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے اسے سب سے پہلے پیدا کیا۔ یہ پہلے پیدا کرنے کا تصور' معلوم نہیں یونانیوں کے ہاں سے اِدھر آیا یا ان کے ہاں سے اُدھر گیا ہے۔ اصل میں اہل یونان اور اہل ایران کی فکر اور ان کے تصورات کا آپس میں ایسے تبادلہ ہوا کہ وہ باہم گڈمڈ ہو گئے ہیں لیکن یونانیوں کا تصور ہے کہ خدا نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا' وہ عقل تھی۔ عقل کے لیے قدیم یونانی زبان کا لفظ "LOGOS" ہے (جو عموماً چھوٹے حروف سے لکھا جاتا ہے)۔ یہ ارسطو (384-322 B.C.) کا دور تھا اور ارسطو کا LOGIC (منطق) تو بہت ہی بھرپور ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اسے گزرے ہوئے اڑھائی ہزار سال ہو گئے ہیں لیکن اس کے LOGIC کے جو بندھے ہوئے مسلّمے ہیں' آج تک نہیں ٹوٹ سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان یونانیوں کے ہاں LOGIC (منطق) پہ بہت زور تھا۔ ہاں تو زرتشتیوں نے کہا کہ خدا نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا تھا۔ ہمارا تصوف یہ کہتا ہے کہ عقلِ کل ازلی پیدائش سے تھی۔ تصوف میں بھی ہمارے ہاں عقلِ کل ہے لیکن اس کو اتنا بلند مرتبہ

دینے کے بعد یہ اسے اس مقام تک لے آئے کہ وہ اس مادے کی دنیا (MATERIALITY) میں آنے کے بعد جس چکر میں الجھی ہے' تو اپنا مقام ہی کھو بیٹھی۔

تصوف کی دنیا میں عقل کا مقام اور حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کے متعلق عیسائیت کا تصورِ حیات

یونانیوں کے LOGOS (عقل) کے نعرے نے عیسائیت کو متاثر کیا چنانچہ یوحنا کی انجیل کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ خدا نے سب سے پہلے LOGOS (عقل) کو پیدا کیا۔ ان لوگوں نے اپنے ہاں LOGOS (عقل) کا ترجمہ ''کلمہ'' کیا ہے۔ یہ بھی عجیب معمہ ہے کہ انہوں نے عقل یا LOGIC کی بجائے اس کا ترجمہ ''کلمہ'' کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسلام کے بعد کی بات ہے کیوں کہ قرآن نے حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے متعلق ''کلمہ'' کہا ہے چناں چہ انہوں نے اسلام سے سند لینے کے لیے اس کو کلمہ کہا اور کہا کہ سب سے پہلے خدا نے یہ پیدا کیا۔ مسیح علیہ السلام کے متعلق ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ ازلی ہے یعنی مریمؑ کے ہاں پیدا ہونے والا مسیح علیہ السلام تو اصل مسیح علیہ السلام کا ILLUSION ہے' خدا کی طرح وہ ان کے نزدیک ازلی ہے۔ اُسے ازلی بتانے کے لیے انہوں نے کہا کہ کلمہ سب سے پہلے پیدا کیا۔ اب کلمہ کا وجود تھا اور کلمہ آخر میں آ کر مسیح علیہ السلام بن گیا۔ اس میں جو اتنی بھول بھلیاں ہیں جن میں یہ پھنسے ہوئے ہیں وہ ان کے ہاں عقلِ اول ہوئی' اور جو یونان کا LOGOS (عقل) تھا' وہ کلمہ بنا' گو کہ انگریزی میں انجیل میں LOGOS ہی درج ہے۔ انہوں نے پھر انجیل کا عبرانی میں ترجمہ کیا اور اس کے بعد عربی میں اسے ''کلمہ'' لکھا اور اردو تراجم میں بھی اس کو کلمہ ہی کہتے ہیں۔ یہ ان چیزوں کو ازلی مانتے ہیں۔

ہندو مذہب میں تین خداؤں کے بعد پہلی پیدائش ''پاروَتی'' اور ایرانیوں کے ہاں ''سروش'' کی ہے

''ہندوؤں نے اے سیاپا ای مکایا' او ہناں نیں سب توں پہلاں کہیا'' (ہندوؤں نے یہ مشکل ہی ختم کر دی' انہوں نے سب سے پہلے بتا دیا) کہ ان کے ہاں تین خدا ہیں: برہما' ایشور جی' شیو جی۔ ان تین خداؤں کے بعد' سب سے پہلے جس کی پیدائش ہوئی وہ شیو جی کی بیوی ''پاروَتی'' ہے کیوں کہ اس کے بغیر آگے کام نہیں چلتا تھا۔ ہمیں بھی تو اتاں حوّا کا تصور دیا ہوا ہے۔ وہ کہیں سے یہ تین خدا تو لے آئے' مگر اب آگے سلسلہ نہیں چلتا تھا۔ تاہم آپس میں بیٹھ کر کانفرنس کی ''او ہناں نیں کہیا ہونا' پئی او ہناں تیناں اچوں اک داو ہیا کرادو'' (انہوں نے کہا ہوگا کہ ان تینوں میں ایک کی شادی کرا دو)۔ ان کے ہاں جو سب سے پہلی پیدائش ہے وہ عورت کے لحاظ سے ''پاروتی'' ہے جس طرح ہمارے ہاں اتاں حوا ہے۔

ان یونانیوں کے ہاں LOGOS (عقل) ہے' ایرانیوں کے ہاں ''سروش'' ہے' اصل میں ہمارے ہاں تصوف میں متکلمین نے یہ عقلِ کل یا عقلِ اول کی اصطلاح وضع کی تھی۔ سروش یہاں ان ہی معنوں میں ہے' جن معنوں میں ''قاصد'' لیا جاتا ہے۔ یہ پیغام رساں کے معنوں میں ہے یعنی خدا کی طرف سے پیغام لانے والا۔ اب ان کی شاعری میں جو شاعر INTUITION (وجدان) دیتا ہے' وہ بھی ''سروش'' ہے۔ عربی میں ''ہاتف'' اور ان ایرانیوں کے ہاں

''سروش'' ہے۔

جلوۂ سروش

تصوف میں وجود اور شہود کی دو اصطلاحات کی ماہیت:

اب ''جلوہ سروش'' (غیبی فرشتے کا ظہور) کے عنوان سے بات شروع ہوتی ہے۔ کہا کہ

مردِ عارف گفتگو را در بہ بست مستِ خود گردید و از عالم گسست!

(مرد عارف نے گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ اپنے آپ میں مست ہو گیا اور اس نے عالم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا)۔

اب وہی تصوف آ گیا۔ وہ ہماری خاطر اس عالمِ شہود کے اندر اترا تھا۔ جب اس نے بات ختم کر دی یہاں سے سلسلہ منقطع ہوا اور ''مستِ خود گردید'' اپنے آپ میں مست ہو گیا۔

ذوق و شوق اورا ز دستِ او ربود

(اس کے ذوق و شوق نے اسے اس کے ہاتھ سے چھین لیا)۔

کیا شاعری ہے صاحب! کہا ہے کہ اس کے ہاتھوں سے اس کو لے گیا۔

در وجود آمد زنیرنگِ شہود

(اور وہ ''شہود'' کے طلسم کو توڑ کر ''وجود'' میں آ گیا)۔

یہ ہے جی! وجود اور شہود۔ ان کے ہاں یہ تصوف کی دو اصطلاحات ہیں۔ خدا کو تو ''وجود'' کہتے ہیں یعنی خدا کو واجب الوجود کہتے ہیں اور یہ کائنات کو ''شہود'' کہتے ہیں یعنی جو چیز مشہود ہے' جو چیز PERCEPTIBLE (قابلِ ادراک) ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (39:46) کہا ہے۔ غیب اور شہادت اپنے لیے کہا ہے۔ جو غیب ہے' وہ ہمارے PERCEPTION (ادراک) میں نہیں آ سکتا اور جو شہود ہے' وہ ہمارے SENSE PERCEPTION (ادراک بالحواس) میں آ سکتا ہے۔ اس لیے تصوف کے نقطہ نظر سے ''وجود'' تو خدا ہے اور ''شہود'' کائنات ہے۔ پھر ان کے ہاں جب ''ہمہ اوست'' والے آئے' وحدت الوجود والے آئے' تو انہوں نے یہ بات کہی کہ جو کچھ تمہیں شہود (نظر) میں آتا ہے' یہ درحقیقت اسی ''وجود'' کے مختلف پرتو ILLUSION (دھوکا' سراب) ہیں' یہ EXIST نہیں کرتا۔

اقبالؒ کے نزدیک اس کائنات کی کیفیت

اقبالؒ کو بھی آپ نے دیکھا ہوگا' یہ ہمیشہ اس کائنات کو' جو موجود ہے' کہیں ''طلسم'' کہیں ''نیرنگ'' اور کہیں ''سحر'' کہتا ہے یعنی اس کو ILLUSION (دھوکا' فریب) کہتا ہے' ایسا نہیں کہ یہ EXIST کرتی ہے بلکہ اقبالؒ کے مطابق یہ EXIST نہیں کرتی۔ اس شعر میں آپ دیکھیے' اس نے ''نیرنگ'' کہا کہ ILLUSION (سراب) ہے۔ کہا وہ جتنا وقت ہمارے ساتھ باتیں کر رہا تھا' ''نیرنگِ شہود'' کے اندر تھا' اس محسوس کائنات کے ''طلسم'' کے اندر' ایک طلسماتی سا ''وجود''

تھا۔ جو بعد ازاں سمٹ کر ''وجود'' کے اندر چلا گیا یعنی وہی جو خدا تھا' وہ اس کے اندر جا کر مل گیا۔ ان کے مطابق تو بالآخر وہاں چلے جانا ہے۔ آپ کے ہاں وحدت الوجود کا تصور محی الدین ابن عربیؒ (638-560ھ) کے ذریعے چلا آ رہا ہے۔ مجدد سرہندی (وفات 1034ھ) نے اس نظریئے کا توڑ پیش کیا۔ ان کا فلسفہ وحدتِ شہود ہے جس کے مطابق یہ تمام کائنات ایک INDIVISIBLE WHOLE (ناقابلِ تقسیم کل) ہے' اس میں وحدت ہے۔ یہ وحدت الوجود کے مقابلے میں زیادہ جی لگتی بات ہے جو انہوں نے کہی ہے۔ یہ اچھی چیز تھی' محی الدین ابنِ عربیؒ کا توڑ تھا لیکن اس کے بعد ہمارے ہاں شاہ ولی اللہؒ (1176-1114ھ) آ گئے۔ بیچ میں جو ثالث بننے والے آتے ہیں یہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں' یہ COMPROMISE (مفاہمت) کرنے والے ہوتے ہیں۔ انہوں نے آ کر کہا کہ نہیں صاحب! یہ وحدتِ شہود اور وحدتِ وجود' درحقیقت آگے جا کر ایک ہی بات ہو جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کا سارا فلسفہ وحدتِ شہود اور وحدتِ وجود' دونوں کو باہم ضم کر کے ایک ثابت کرنے کا آرزومند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وجود رہا' نہ شہود رہا' COMPROMISE (مفاہمت) میں تو کچھ بھی نہیں رہ سکتا۔

ابن رشد کا کردار' افلاطون اور ارسطو کی تعلیم کے خدوخال' سرہندی کی سعی وکاوش اور نقشبندیوں کا عمل

ہمارے ہاں فلسفے کی دنیا میں اس قسم کی ATTEMPT (کوشش) ابنِ رشد (1198-1126/595-520) نے کی تھی۔ اس سے پہلے جو متکلمین تھے' وہ کچھ تو PLATO (افلاطون: 428-347 B.C.) کے FOLLOWERS (پیروکار) تھے اور کچھ ارسطو (384-322 B.C.) کے' اور ان کی تو آپس میں بہت ٹھنی تھی حالانکہ ارسطو تو پلیٹو (افلاطون) کا شاگرد تھا لیکن اس نے فکر کا اپنا الگ اسکول کھولا جبکہ ارسطو کی تردید کرتے ہوئے افلاطون نے اپنا الگ مکتب فکر (SCHOOL OF THOUGHT) کھولا۔ PLATO (افلاطون) تو عالمِ تخیلات میں BELIEVE (یقین) کرتا ہے لیکن ارسطو اس کائنات میں BELIEVE کرتا تھا' یہ ان کے TWO SCHOOLS OF THOUGHT (دو مکاتیبِ فکر) چلے آتے تھے۔ مسلمان متکلمین میں سے کچھ تو PLATO (افلاطون) کے FOLLOWERS (پیروکار) تھے اور کچھ ارسطو کے۔ یاد رکھیے! جسے اسلامی فلاسفی کہتے ہیں یہ کوئی شے نہیں ہے۔ ہم جسے فلاسفر کہتے ہیں' وہ تو کسی ایک کمرے میں بیٹھا ہوا' دنیا گھوم رہا ہے' آسمان کی باتیں کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ خود جا کر دیکھنے کا سوال ہی نہیں حالانکہ قرآن تو حقائق سے بحث کرتا ہے۔ جسے ہم مسلم فلاسفی کہتے ہیں' آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی نہ کسی رنگ میں وہی یونانی فلاسفرز کا چربہ ہوگا۔ انہوں (عربوں) نے یونانی لٹریچر (ادب) کے ترجمے کیے تھے اور انہی کا فلسفیانہ رنگ ہم پر بھی چڑھ گیا۔ چنانچہ TWO SCHOOLS OF THOUGHT (دو مکاتیبِ فکر) چلے آ رہے تھے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ ابنِ رشد (1198-1126/595-520) نے پہلے ارسطو اور پلیٹو (افلاطون) کے نظریات میں

مفاہمت پیدا کی۔ یہ شخص بڑے پائے کا مفکر ہے اور اس نے بڑی محنت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کے اندر نہ پلیٹو (افلاطون) باقی رہا' نہ ارسطو باقی رہا۔ اُدھر تصوف کی دنیا میں یہی کچھ شاہ ولی اللہؒ (ھ 1176-1114) نے کیا حالانکہ اگر یہ اس کو سرہندیؒ (وفات 1034ھ) کے نظریات ہی رہنے دیتا اور اسی کو آگے لے جاتا' تو یہ ایک بڑے کام کی چیز ہو جاتی' کم از کم وحدتِ وجود تو ختم ہو جاتا کیونکہ ابن عربی (ھ 638-560) کا توڑ مجدد سرہندیؒ نے پیش کیا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ وہ خود صوفی ہے اور دوسری طرف صاحبِ شریعت ہے۔ یہ ولی اللہؒ بڑی مصیبت میں پھنسا رہتا ہے۔ صوفی ہونے کے اعتبار سے تو وہ وحدتِ وجود ہی کا قائل تھا' جب شریعت میں آیا ہے تو وہاں وجود چلتا نہیں تھا' وہاں اسے مجدد سرہندیؒ (وفات 1034ھ) کے مشہود کے بارے میں دلائل زیادہ وزنی لگے۔ اب یہ کس کو رکھتا' کس کو چھوڑتا چنانچہ اس نے پھر کوشش کی کہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود دونوں کو کسی طرح صحیح ثابت کر کے ایک بنا دیا جائے۔ آپ کے ہاں شاہ ولی اللہؒ نے یہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ ولی اللہؒ کا گڈ مڈ فلسفہ تو چلا مگر سرہندیؒ کو آگے کوئی ایسا نہ ملا جو اس کے فلسفے یا تصوف کو لے کر آگے بڑھتا۔ وہ نقشبندیوں کے اندر سمٹ کر رہ گیا اور نقشبندیوں نے سرہندیؒ کے فلسفہ کو تو نہیں لیا' صرف اس کے تصوف کو لیا' لہٰذا جو پتے کی بات کہہ گیا تھا وہ وہیں دب کر رہ گئی۔ اگر شاہ ولی اللہؒ اپنا نظریہ وضع نہ کرتا تو بات آگے چل نکلتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے ہاں وحدتِ وجود ہی چلا۔ وحدتِ وجود تو قائم رہا مگر سرہندیؒ کا وحدتِ شہود ختم ہو گیا' شاہ ولی اللہؒ نے جو ATTEMPT (کوشش) کی وہ اس کی کتابوں میں رہی' بعد میں کسی نے اس کو پوچھا ہی نہیں۔ جو چیز آگے چلتی ہے' وہ تو کوئی DISTINCT (متمیّز) چیز ہوتی ہے' COMPROMISE (مفاہمت و مصالحت) کی چیز کبھی آگے نہیں چلا کرتی۔

ہاں تو میں ''وجود اور شہود'' کی بات کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں تصوف میں ''وجود اور شہود'' یہ دو اصطلاحات ہیں چنانچہ آپ کے ہاں یہ دو ''وجودیئے'' اور ''شہودیئے'' چلے آ رہے ہیں۔ وحدتِ وجود والے ''وجودیئے'' کہلاتے ہیں اور وحدتِ شہود والے ''شہودیئے'' کہلاتے ہیں۔ یہاں اس شعر کے اس مصرع ''در وجود آمد ز نیرنگِ شہود'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف ہماری خاطر نیرنگِ شہود میں آیا ہوا تھا۔ وہ اس طلسم کے اندر' اس سحر کے اندر' نہیں تھا۔ اس کے بعد جب اس نے بات ختم کی تو پھر اس شہود کے نیرنگ سے نکل کر' وہ ''وجود'' کے اندر چلا گیا۔

با حضورش ذرّہ ہا مانندِ طور

(اس کی حضوری سے ذرّے طور کی مانند تھے)

یہ جو حضورش ہے اس کا ''ش'' وجود کے لیے ہے یعنی خدا کے لیے۔ جب یہ لوگ ''وجود'' کہیں گے تو اس سے مطلب ''خدا'' ہوگا۔ اب اس میں کہا یہ ہے کہ اگر کوئی اس کے حضور میں ہو یعنی خدا یا وجود کے حضور تو ایک ایک ذرہ طور کی مانند ہوتا ہے۔

بے حضورِ او نہ نور و نے ظہور!

(اس کی حضوری کے بغیر نہ نور تھا' نہ ظہور)

اور اگر اس کا ''حضور'' نہیں تو اس کے بعد کائنات کے اندر ''ظہور'' ہیں۔ظہور کا معنی ہو گیا ''خود جو وجود ہے'' وہ اس کائنات کے اندر ہے' جو ظہور کی شکل میں ہے''۔اب اس کا ظہور ہوتا ہے تو کائنات بنتی ہے۔اگر اس کے حضور میں کوئی نہیں ہے' تو نہ کائنات اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے اور نہ کائنات کو سمجھانے والی روشنی اس کے لیے کہیں EXIST کرتی ہے۔نور یہاں وہ روشنی ہے جس سے ہم کائنات کی ان چیزوں کا احساس اور ادراک کر سکتے ہیں۔اگر اس ''وجود'' کا کسی کو ''حضور'' نہ ہو تو پھر اس کے لیے ظہور میں آنے والی یہ کائنات بے معنی سی رہ جاتی ہے۔اس کو وہ روشنی میسر نہیں جس سے وہ اس کا ادراک کر سکے۔یہ بات ہے جو ابھی تک اس نے کہی ہے۔

نازنین کی خصوصیت

اب آگے وہ ''سروش'' آتا ہے۔اس شکل میں سروش آ رہی ہے۔ان کے ہاں یہ آ رہی ہوتا ہے' آ رہا نہیں ہوتا۔

نازنینے در طلسمِ آں شبے آں شبے بے کوکبے را کوکبے!

(اس رات کے طلسم کے اندر ایک نازنین نمودار ہوئی جو اس بے ستارہ رات کے لیے ستارہ کی مانند تھی)

اسے یوں کہیے کہ ایک نازنین اس تاریک رات کے طلسم میں آسمان سے نیچے اتر رہی ہے۔وہ ستاروں سے محروم رات میں ایک ایسی نازنین ہے جو بذاتِ خود اس تاریک رات کے لیے ایک ستارہ ہے۔آں کے معنی ہیں آں نازنین' آں نازنین' آں شبے را کہ بے ستارہ است بجائے خویش کوکب است' یوں ہو گئی بات کہ شبے بے ستارہ کے لیے وہ نازنین ستارہ تھا۔اب اس نازنین کی تعریف ہونی شروع ہو رہی ہے۔

سنبلستانِ دو زلفش تا کمر تاب گیر از طلعتش کوہ و کمر

(اس کی دونوں زلفوں کے سنبلستاں۔سنبل کی طرح سیاہ اور خوشبودار بالوں والی زلفیں۔اس کی کمر تک لٹکے ہوئے تھے' اس کے چہرے سے کوہ و کمر روشنی حاصل کرتے تھے)

یعنی دونوں زلفوں کے سنبلستان تا کمر تھے' اسی کی تو تلاش تھی' روشنی جلوہ تھا' اس سے کوہ و کمر' وادیاں اور پہاڑ نورانیت لے رہے تھے۔

غرق اندر جلوۂ مستانۂ خوش سرود آں مستِ بے پیمانۂ

(وہ جلوۂ مستانہ میں غرق تھی۔شراب کا پیالہ پیے بغیر اس مست نازنین نے اچھا نغمہ چھیڑا)

یہاں اُسے ''مستِ بے پیمانۂ'' کہا ہے۔اسے ریاض خیر آبادی (ولادت 1270ھ) نے بھی کچھ یوں کہا ہے کہ

ہے ریاض ایک رندِ مست خرام نہ پیئے اور جھومتا جائے

''ایک رندِ مستِ خرام ہے'' نہ پیے بھی جھومتا چلا جائے۔

ہندوؤں کی دیوالی میں ایک بت کے اندر فانوس کو روشن کرنے کا مقصد

اب آگے ہندوؤں کی دیوالی میں ایک بت کے اندر فانوس روشن کرنے کا مقصد آ رہا ہے۔ کہا کہ

پیش او گردندہ فانوسِ خیال ذوفنوں مثلِ سپہرِ دیر سال

(اس کے سامنے خیال کا فانوس گردش کرتا تھا جو پرانے یا بڑی عمر والے آسمان کی طرح' ذوفنوں تھا یعنی دل لبھانے کی بہت سی تدبیروں سے وہ واقف تھی)

یہاں یہ ''فانوسِ خیال'' آیا ہے۔ پتہ نہیں ہمارے نوجوانوں نے دیکھا یا نہیں؟ ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے۔ ہندوؤں کی دیوالی میں ایک فانوس بنا کرتا تھا۔ اس کے اندر دِیا اور ایک چکر ہوتا تھا۔ وہ تاگے کے ساتھ کسی گتے یا کسی موٹے سے کاغذ کو کاٹ کر ہاتھی' گھوڑا' شیر اور آدمی بنا کر' اس کے اندر لگا دیتے تھے۔ اس کے باہر باریک کاغذ سے اسی طرح کا گول دائرے کی شکل کا فانوس بنا ہوتا تھا۔ اس کے اندر موم بتی جلاتے تھے اور اندر والے چکر کو گھماتے تو اس کا سایہ باہر والے پہ آ کر پڑتا تھا۔ سفید کاغذ کا بنا بیرونی حصہ اچھا خاصا اونچا ہوتا' اس کے اندر اسی طرح اور اسی سائز کا دائرہ ہوتا تھا' جس کے اندر تاگے بندھے ہوئے ہوتے تھے' تاگوں کے اندر گتے سے بنی ہوئی اس قسم کی مورتیں اس میں لٹکائی ہوئی ہوتیں' اس کے اندر دیا بھی ہوتا جس کی روشنی کی بدولت اس کا عکس سفید کاغذ پر پڑتا پھر وہ اندر والے چکر کو انگلی سے گھماتا تو یوں لگتا کہ یہ دوڑ رہے ہیں' گھوڑا دوڑ رہا ہے اور سائیکل والا آدمی ہے جس کے گرد بچے کھڑے ہیں' پوچھو نہیں اس زمانے میں کتنا تماشا ہوتا تھا۔ اپنے بچپن میں' دیوالی کے موقعہ پر ہم نے ہندوؤں کے ہاں یہ دیکھا ہے۔ وہ اسے فانوسِ خیال کہتے تھے۔ اب آپ دیکھیے فانوسِ خیال شے کیا ہے؟ یہ EXIST نہیں کرتا' سایہ ہی سایہ ہے' مگر بت بڑا دلچسپ ہے۔ اس کے اندر حرکت بھی ہے' بھاگ بھی رہے ہیں لیکن فانوسِ خیال ہے۔ اسے کہا ہے کہ

پیشِ او گردندہ فانوسِ خیال

(اس کے سامنے فانوسِ خیال گردش کرتا تھا)

وہ فانوس EXIST نہیں کرتا تھا' وہ تو صرف سایہ ہی سایہ ہوتا تھا

تنہا عقلِ انسانی کا یہ سفرِ حیات ان گنت خود ساختہ افسانوں کی بنیاد پر فانوسِ خیال کی آماجگاہ میں صدیوں سے الجھا دکھائی دے رہا ہے

یہ ساری کائنات اس کے سامنے ایسے تھی جیسے ایک فانوسِ خیال ہوتی ہے اور گردش میں بھی ہوتی ہے۔

ذوفنوں مثلِ سپہرِ دیر سال

اُس آسمان کی طرح جو بڑی لمبی عمر کا ہے' نازنین وہ ہزاروں قسم کے فن جانتی تھی۔ فانوسِ خیال میں اسے کیا کچھ نظر آ رہا ہے؟ کہا کہ

اندر آں فانوس پیکر رنگ رنگ شکرہ بر کنجشک و بر آہو پلنگ!

(اب اُس ''فانوسِ خیال'' کے اندر رنگ رنگ کے پیکر ہیں' شکرہ چڑیا پر اور چیتا ہرن پر' جھپٹتا ہوا نظر آ رہا ہے)

اب دیکھا اس ''فانوسِ خیال'' میں کیا کیا چیزیں نظر آ رہی ہیں!

فانوسِ خیال سے آگاہی حاصل کرنے کی تمنا لیے ہوئے علامہ اقبالؒ رومیؒ کے حضور

من بہ رومیؒ گفتم اے دانائے راز بر رفیقِ کم نظر بکشائے راز

(میں نے رومیؒ سے کہا: اے رازوں کے جاننے والے! اپنے کم نظر ساتھی پر یہ راز کھول)۔

وہ بات یہیں سمجھ میں آتی ہے۔ اب اقبالؒ خود رفیقِ کم نظر بنتا ہے اور رومیؒ سے پوچھتا ہے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا' تُو ''بکشائے راز'' ہو' یعنی راز افشاں کر دے۔

گفت ''ایں پیکر چو سیمِ تابناک زاد در اندیشۂ یزدانِ پاک!

(رومی نے کہا کہ یہ چاند کی طرح کا روشن پیکر' ''یزدانِ پاک'' کی فکر میں پیدا ہوا ہے)۔

یا اللہ! دیکھا کہ اس کی پیدائش کہاں ہو رہی ہے؟ فکرِ یزداں کے تحت اس کی پیدائش ہوئی' تصورِ خدا کے اندر اس کی پیدائش ہوئی۔ وہ یزدانِ پاک اس لیے ہے کہ زرتشت کے اعتبار سے اہرمن سے اس کو الگ کرنا چاہتے ہیں' اس لیے اس کو یزدانِ پاک فکر کے اندر کہا ہے۔ اس سروش' اس نازنین' کی تخلیق ہوئی تھی۔

باز بے تابانہ از ذوقِ نمود در شبستانِ وجود آمد فرود

(پھر یہ ذوقِ نمود سے بے تاب ہو کر' وجود کے شبستان میں اتر آئی)

یعنی پھر وہ ذوقِ نمود سے شبستان وجود کے اندر آ گئی۔ اب یہاں دیکھیے' یہ شخص پھر غلطی کر گیا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ شبستانِ وجود کے اندر آ گئی۔ وجود کے معنی یہاں EXISTENCE کے ہیں حالانکہ وجود کے معنی یہ ہمیشہ ''وجودِ باری تعالیٰ'' لیتے ہیں' واجب الوجود لیتے ہیں' لیکن یہاں ''آمد فرود'' آیا ہے کہ دیکھا! یہ نیچے اتر آئی۔ فکرِ یزداں کے اندر تخلیق ہوئی تھی اور پھر اس عالمِ وجود میں یہ نیچے اتر آئی۔

ہمچو ما آوارہ و غربت نصیب تو غریبی من غریبم او غریب!

(یہ ہماری طرح آوارہ و غریب ہے' تُو بھی مسافر' اجنبی اور میں بھی مسافر و اجنبی ہوں)۔

غریب کے معنی عربی زبان میں مسافر یا اجنبی ہوتا ہے' مفلس نہیں ہوتا۔

شانِ او جبریلی و نامش سروش می برد از ہوش و می آرد بہوش

(اس کی شان جبریل ہے اور اس کا نام سروش ہے۔ وہ ہوش لے جاتی ہے اور ہوش لاتی ہے)۔

---

❶ یہ مقالہ' پرویز صاحب کے مجموعۂ مضامین ___ بہارِ نو ___ میں چھپ چکا ہے۔

یہ دونوں ہی کام کر جاتی ہے۔ اور اب دیکھیے کہ یہ اس کے اندر کیا کچھ کرتی ہے! کہا کہ

غنچۂ مارا کشود از شبنمش مردہ آتش زندہ از سوزِ دمش

(اس کی شبنم سے ہمارا غُنچہ کھلتا ہے' اس کے دم سے مُردہ آگ زندہ ہو جاتی ہے)۔

مردہ آتش' بجھی ہوئی آگ کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ خاکستر بھی اس کی پھونک سے زندہ ہو جاتے ہیں۔

زخمۂ شاعر بسازِ دل ازوست

(سازِ دل پر شاعر کی مضراب اس سے ہے) یہ ہے وہ سروش جو شاعروں کے کام آتا ہے۔ اب یہ شاعروں کے حصے میں رہ گیا ہے۔ دل کے ساز کو جب شاعر کا مضراب چھوتا ہے تو شاعری بڑی خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ اور آگے مصرع بڑا اونچا ہے۔

چاکہا در پردۂ محمل ازوست

(محمل کے پردے میں چاک اس سے ہیں) یعنی محمل کے اندر بیٹھی ہوئی لیلیٰ ہے' تو چھپی ہوئی ہے لیکن سروش' دل کے اندر کچھ کرتا ہے تو پھر وہ چوری چوری محمل کے اندر پردہ چاک کر کے جھانکنے لگ جاتی ہے۔ یعنی خود معشوق کے دل میں بھی جو نمود کا ذوق پیدا ہوتا ہے وہ سروش کی وجہ سے ہے۔ یہ خوبصورت مصرع ہے: ''چاکہا در پردۂ محمل ازوست''

دیدہ ام در نغمۂ او عالمے آتشے گیر از نوائے او دمے!''

(میں نے اس کے نغمے کے اندر ایک عالم دیکھا ہے۔ تُو بھی اس کی نوا سے ایک لمحہ کے لیے حرارت (آتش) حاصل کر)۔

اب اس نے کچھ گانا شروع کیا ہے۔

نوائے سروش

اب اگلا عنوان ''نوائے سروش'' آتا ہے۔ یاد رہے کہ سروش ایک فرشتے کا نام ہے اور ''نوائے سروش'' فرشتے کا نغمہ ہے۔ یہ صوفیا کے ہاں ایک پرانی غزل چلی آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی (1356-1274ء)' جو خواجہ حضرت نظام الدین اولیا (1325-1238ء) کے خلیفہ ہیں' یہ ان کی غزل ہے۔ یہ ''بسراب اندر'' اور ''بگلاب اندر'' ابھی آتا ہے۔ یہ مشہور ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ گیت پیارے لال صاحب کا گایا ہوا ہے' ریکارڈ کے ایک طرف یہ ہے کہ

کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو ان دنوں جوشِ جنوں ہے میرے دیوانے کو

اس ریکارڈ کے ایک طرف یہ تھا اور دوسری طرف یہ ''بہ حجاب اندر'' بکتاب اندر' بہ سحاب اندر'' بگلاب اندر'' تھا اور اس نے بڑا خوبصورت گایا تھا۔ یہ پرانی غزل ہے' اس پہ اقبالؒ نے یہ کہا ہے اور اس کو ''سروش'' سے گوایا ہے۔

سراب کے اندھیروں میں چلنے والی کشتی منزل سے ہم کنار ہو ہی نہیں سکتی

اس غزل کا پہلا مصرع یہ ہے:

ترسم کہ تو مے رانی زورق بسراب اندر

(میں ڈرتا ہوں کہ تُو سراب میں کشتی چلاتا رہے گا)۔ یہ لوگ عقل کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں ''پے گیا ایہناں دے پیچھے لٹھ لے کے'' (ان کے خلاف لٹھ لے کر کھڑا ہو گیا)۔ کہتا ہے کہ تُو کرتا کیا ہے؟ کیا سراب کے اندر کشتی چلانا چاہتا ہے؟ یہ تو بتا کہ بھلا سراب میں چلی ہوئی کشتی بھی کبھی ساحلِ مراد تک پہنچ سکتی ہے۔ جو لوگ عقل کے ذریعے حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ ایسا ہی ہے جیسے سراب میں کشتی چلانا۔ اگلے مصرع میں کہا کہ

زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر !

(تُو حجاب میں پیدا ہوا اور حجاب میں مر جائے گا) یعنی یہ عملِ پیدائش ہے' یہ بھی حجاب میں اور جو موت ہے وہ بھی حجاب میں ہے اس لیے تصوف میں علم کے متعلق کہا گیا ہے کہ العلم حجاب الاکبر (جو شخص حقیقت کو عقل کے ذریعے سمجھنا چاہتا ہے' وہ بیکار وقت ضائع کرتا ہے' حقیقت اس سے حجاب میں ہے اور حجاب ہی میں رہے گی)۔ ان اہلِ تصوف کے ہاں یہ مسلمہ ہے۔ انہی کے ہاں بعض چیزیں مسلمات میں ہیں۔ مسلمات کے معنی ہیں جو صوفیوں کے سارے خانوادوں [1] کے اندر مشترکہ ہوتی ہیں مثلاً

تُوں علموں بس کریں او یار اِکّو الفّ تینوں درکار

(بابا بلھے شاہ)

اور اسی طرح سے

احد ' احمد وچہ فرق نہ بلّھیا اک رتی بھر مروڑی دا

(احد اور احمد میں کوئی فرق ہی نہیں۔ یہ جو تم فرق دیکھتے ہو' وہ ایک ذرا سی ''مروڑی'' (پیچ) ہے اور بس۔ احمد میں م ہٹا دو تو وہ بس احد بن جاتا ہے)۔

یہ ''العلم حجاب الاکبر'' سارا وہاں سے آیا ہوا ہے۔ کہا ہے کہ

زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر !

علم اور عقل کی دنیا کے اندر پھرتا رہا' پردوں میں پیدا ہوا' پردوں ہی میں مر گیا اور اپنی کشتی کو سراب کے اندر چلاتا رہا' بھلا کہاں پہنچے گی یہ کشتی!! اب یہاں سے بات صاف ہو گئی۔

---

[1] برّصغیر پاک و ہند میں صوفیائے کرام کے چار خانوادے مشہور ہیں: (1) چشتیہ (2) صابریہ' (3) سہروردیہ اور (4) نقشبندیہ۔ ترکوں میں بیکتاشی فرقہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے بانی حاجی بیکتاش ولیؒ تھے جو 680ھ میں خراسان میں پیدا ہوئے اور 738ھ میں وفات پائی۔ کشمیر میں نوربخشی سلسلہ نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس کے بانی سیّد محمد بن عبداللہ (پیدائش 795ھ) تھے اور ان کا لقب نوربخش تھا۔ ایک شطاریہ خانوادہ ہے۔ صوفیہ میں ایک فرقہ ملامتیہ بھی کہلاتا ہے۔ ویدانت نے قادریہ اور شطاریہ مسلک کو متاثر کیا (ماخوذ از پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص: 88,87,77)۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک رومیؒ اور رازیؒ کا تقابلی اور تعلیمی مقام

آگے کہا کہ

چوں سرمۂ رازیؒ راازدیدہ فروشستم تقدیرِ امم دیدم پنہاں بکتاب اندر!

(جب میں نے رازیؒ کے سرمہ کو اپنی آنکھوں سے دھوڈالا تو میں نے کتاب کے اندر امتوں کی تقدیر چھپی ہوئی دیکھی)

یہ شخص (اقبالؒ) رازیؒ (مشہور مفسّرِ قرآن) اور رومیؒ کو ہمیشہ CONTRAST (تقابل) میں پیش کرتا ہے۔ مثلاً

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں کبھی سوز وسازِ رومیؒ، کبھی پیچ وتابِ رازیؒ

(بالِ جبریل)

رازیؒ اور رومیؒ کی سوچ میں فرق، رازیؒ کے تصورات پر علامہ اقبالؒ کا تنقیدی جائزہ

امام رازیؒ (1209-1149/606-543) نے قرآنِ مجید کی جو اس کی اپنی تفسیر لکھی، وہ دلائل کی بنا پہ لکھی ہے اس لیے تمام اہلِ تصوف اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ امام رازیؒ اصل میں عقلی دلائل کی SYMBOL (علامت) ہے اور رومیؒ ان کے ہاں عشق، سوز اور جذبات کی SYMBOL (علامت) ہوتا ہے۔ یہ تفاوت ان دونوں کے علم کے CONTRAST (تقابل) میں آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے جب میں نے رازیؒ کا سرمہ آنکھوں میں لگا لیا تو اندھا ہوگیا۔ جب میں نے اس سرمے کو دھوکر نکال دیا، ''فروشستم'' کے معنی بالکل ہی نکال دیا، ہاں تو جب میں نے رازیؒ کے سرمے کو دل کی آنکھوں سے دھوکر نکال دیا تو اس وقت مجھے قرآن کے اندر قوموں کی تقدیریں نظر آئیں۔

تصوف کی تائید کے بعد اس سے کنارہ کشی کا سبق

برکشت وخیاباں پیچ، برکوہ و بیاباں پیچ برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر

(تُو کھیتی اور خیابان پر گر، پہاڑ اور میدان پر گر۔ وہ بجلی جو خود پر گرتی ہے، بادل کے اندر ہی مرجاتی ہے)۔ اسے یوں سمجھیے کہ جو برق سحاب میں پیدا ہوئی اگر وہ خود سے دست وگریباں رہے اور کسی دوسرے سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو تو جیسی سحاب میں پیدا ہوئی، ویسی سحاب میں مرجاتی ہے۔ اس برق کو یہ چاہیے کہ ''کشت وخیاباں، کوہ و بیاباں'' کے اوپر آ کر گرے تب تو وہ کچھ کام کرے گی لیکن اگر وہ وہیں پیدا ہوئی، اپنے آپ INTROVERSION (باطن پسندی) ہی میں رہی تو وہیں ختم ہوگئی، سحاب کے اندر پیدا ہوگی اور سحاب کے اندر ہی ختم ہوجائے گی۔

یہاں دیکھیے کہ وہ تصوف سے آگے نکل آیا ہے۔ تصوف INDIVIDUAL,PERSONAL EXPERIENCE (انفرادی، ذاتی تجربہ) ہے، باہر کی دنیا کے ساتھ اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ ''بخود پیچیدن'' ہے۔ اقبالؒ تصوف کی تائید کرتا ہوا چلا آ رہا ہے اور یہاں پہنچ کر فوراً کہتا ہے کہ یہ بھی کیا زندگی ہے کہ اپنے لیے، اپنے PERSONAL EXPERIENCE (ذاتی تجربہ) کے اندر جیے، خود ہی پی، اور دوسروں سے کہا کہ ''ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی!'' یہ تو PERSONAL

EXPERIENCE (ذاتی تجربہ) ہوتا ہے' ان کا کسی دوسرے کے ساتھ واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیز کہ اپنے اندر ہی پیدا ہوئے' وہیں ایک EXPERIENCE (تجربہ) کیا' اس کے اندر ہی مر گئے' یہ تو کچھ بات نہیں۔ بات تو یہ ہے کہ آؤ اور ان کے ساتھ ٹکراؤ۔

وائے سنگے کہ صنم گشتہ و شیشہ نہ رسی

یہ بڑا عمدہ مصرع ہے۔ اس پتھر کی بدقسمتی ہے کہ وہ بت بن کر پرستش کراتا رہا۔ ایسا نہ ہو سکا کہ کسی شراب کی بوتل سے آ کر ٹکرائے اور اس کو توڑ دے۔ یہ شعریت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کا شعر ہے' اس لحاظ سے بہت اونچا ہے۔ کیا بننا چاہیے؟

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیسانِ بہار قطرہ گرمے می تواند شد چرا گوہر شند

تاک انگور کی شراب کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اے ابرِ نیسانِ بہار! انگور کی شاخ کے اوپر برس' اسے سرسبز کر دے۔ یہ بہت عمدہ شعر ہے۔

برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر !

(وہ بجلی کہ جو خود پر گرتی ہے' بادل کے اندر ہی مر جاتی ہے' وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتی)۔ یہی خیال اس میں ہے کہ

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

(بالِ جبریل: لالۂ صحرائی)

یہ بات اسی خیال کی پرتو ہے۔

مغربی تہذیب پر علامہ اقبالؒ کا تبصرہ

بامغربیاں بودم پر جستم و کم دیدم

(میں اہلِ مغرب کے ساتھ رہا' میں نے بہت تلاش کیا مگر نہ دیکھا) یعنی میں مغرب کے فلسفے میں' وہاں کی تہذیب کے اندر اتنا عرصہ رہا' میں نے بہت جستجو کی مگر بہت کم پایا۔ اب سوال یہ ہے کہ کس چیز کو کم پایا؟ کہا کہ

مردے کہ مقاماتش ناید بہ حساب اندر !

(اس مرد کو جس کے مقامات حساب میں نہیں آتے)۔ وہاں مجھے ایک انسان بھی ایسا نظر نہ آیا کہ جس کے مقام حساب یا گنتی میں' نہیں آیا کرتے۔

بے دردِ جہانگیری آں قرب میسّر نیست گلشن بگریباں کش اے 'بُو بگلاب اندر' ❶

(جہان کو تسخیر کرنے کی محنت اٹھائے بغیر وہ قُرب حاصل نہیں ہوتا۔ اے گلاب کے اندر رچی بسی خوشبو پر اکتفا کرنے والے شخص! پھولوں کے باغ کو گریباں میں لے)۔ دیکھیے! یہاں پھر تصوف کے خلاف چلا گیا ہے بلکہ اتنا زیادہ 'ایتھے تے

❶ یہ 'بو بگلاب اندر' مشہور غزل صوفیاء کے اس مصرع کی تلمیح ہے: او در من و من در او چوں بو بگلاب اندر

میں کہواں گا بُتھاڑتے دتی اے ایس شخص نے'' (یہاں تو میں کہونگا کہ اس شخص نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہے)۔ وہ شعر سنا دوں جو حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی (1356-1274ء) کا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ غزل بڑی مشہور ہے۔

اے زاہدِ ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی او در من و من در او چوں بو بگلاب اندر

(اے ظاہر پرست زاہد! تُو قُرب کی کیا بات پوچھتا ہے۔ وہ مجھ میں اور میں اس میں اس طرح ہوں جس طرح خوشبو گلاب میں ہوتی ہے)۔ یہ بہت خوبصورت شعر ہے۔ یہ دیکھیے کتنی بڑی مثال دیتا ہے!

صوفی اور زاہد کی مخالفت

بے دردِ جہانگیری آں قرب میسّر نیست

(جہان کو تسخیر کرنے کی محنت اٹھائے بغیر وہ قُرب حاصل نہیں ہوتا' جو ایک مومن کا وصف ہے)۔

دیکھیے یہاں ''دردِ جہانگیری''

تصوف کے بالکل خلاف ہے۔ ان کے ہاں تو جہان سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا ہوتا۔ اقبالؒ نے کہا کہ تُو جو کہتا ہے کہ ''از قرب چہ می پرسی'' وہ براہِ راست اس کے شعر پر صادق آتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ''اے زاہدِ ظاہر بیں' از قرب چہ می پرسی'' وہ DIRECT (براہِ راست) حضرت نصیرالدین دہلویؒ چشتی بزرگ کے شعر پر صادق آتا ہے۔ وہ واضح کرتا ہے کہ بے دردِ جہانگیری قرب کہیں میسر نہیں آتا۔

گلشن بگریباں کش اے 'بُو بگلاب اندر'

(اے گلاب کے اندر رچی بسی خوشبو پر اکتفا کرنے والے شخص! پھولوں کے باغ کو گریباں میں لے)۔ یہ ہے اقبال' ٹکراتا ہے صاحب! اور کہتا ہے کہ ''گلشن بگریباں کش اے بُو بگلاب اندر''۔ (عالم کو تسخیر کیے بغیر قُربِ الٰہی میسر نہیں ہوتا مومن اس کی بدولت تو پوری کائنات کو اپنے اندر سموسکتا ہے)۔

آگے کہا ہے کہ

اے زاہدِ ظاہر بیں گیرم کہ خودی فانی است لیکن تو نہ می بینی طوفاں بہ حباب اندر!

(اے ظاہر کو دیکھنے والے زاہد! میں مانتا ہوں کہ خودی فانی ہے لیکن کیا تُو اس طوفان کو نہیں دیکھتا جو بلبلے میں ہے)۔

اب یہاں آ کر زاہد سے بھی ٹکرا گیا۔ ٹھیک ہے تیرے مطابق خودی تو فانی ہے لیکن تجھے ان طوفانوں کا کیا پتہ جو حباب کے اندر ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے حباب پھٹتا ہے' تو ختم ہو جاتا ہے' پھر وہ سمندر میں جا ملتا ہے لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا' اس کے اندر کی جو طوفان انگیزیاں ہوتی ہیں' تُو اسے کیا جانے! تُو لہٰذا زاہدِ ظاہر بیں سے بھی ٹکرا گیا اور وہ بو بگلاب سے بھی۔

ایں صوتِ دل آویزے از زخمۂ مطرب نیست مہجورِ جناں حورے نالد بہ رباب اندر!

(یہ دل کو لبھانے والی آواز مُطرب کے مضراب سے پیدا نہیں ہو رہی۔ یہ جنت سے بچھڑی ہوئی ایک حور ہے جو رباب

کے اندر آہ و کناں کر رہی ہے)۔

کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہہ رہا ہے کہ کسی موسیقار کے گلے سے نکلنے والی باتیں ہیں۔ کہ وہ ''مہجورِ جناں حورے'' ہیں: بہشت سے نکالی ہوئی ایک حور اس کے فراق میں تڑپ رہی ہے' آہ و فغاں ہے ''نالد'' ہے' رباب کے اندر وصال کے لیے رو رہی ہے۔ یہ بڑا خوبصورت شعر ہے اور یہ رومیؒ کے اُس شعر سے متعلق ہے۔

بشنو از نَے چو حکایت می کند از جدائی ہا شکایت می کند

مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی کی ابتدا اس شعر سے کی ہے۔ اس نسبت سے حضرت علامہ اقبالؒ نے پیر رومیؒ کو ''نَے نواز'' کہا ہے اور ان کے پیغام کو ''نَے'' سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ زبانِ شعر میں' ہر پیغام رساں کو ''نَے نواز'' کہہ کر پکار لیا جاتا ہے۔

رومیؒ کے ہاں شعریت نہیں صرف نظم ہے

یہ رومیؒ کی مثنوی کا پہلا شعر ہے لیکن اقبالؒ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت انداز پیش کر گیا ہے۔ رومیؒ کے ہاں شاعری نہیں ہے' وہ ناظم ہے' اس کے ہاں تو صرف نظم ہے۔ فطرت نے اقبالؒ کو اتنی بڑی کرم گستریاں عنایت کی ہیں کہ نظم کو اس انداز سے کہتا ہے کہ شعریت اتنی غالب آ جاتی ہے۔

حرکت بہ وادیٔ یرغمید الخ

اب اس ''نوائے سروش'' نے وہ غزل سنا دی' ذرا سا سکون ہوا' پھر آگے چل پڑے۔ اگلا عنوان ہے

حرکت بہ وادیٔ یرغمید کہ ملائکہ اورا وادیٔ طواسین می نامند

وادی یرغمید کی طرف حرکت یا سفر' جسے ملائکہ طواسین کا نام دیتے ہیں)۔

یہ ''یرغمید'' تو اس کا اپنا دیا ہوا نام ہے۔

منصور کی کتاب طواسین کے سلسلہ میں لفظ ''طواسین'' کا مفہوم

یہ چاند کی ایک فرضی وادی ہے' اسے علامہ اقبالؒ نے طواسین کا نام دیا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں مقطعات ہیں' اسی طرح اقبالؒ نے نام بنائے ہوئے ہیں۔ اب یہ وادیٔ یرغمید کی طرف چلے گئے۔ جسے وادیٔ طواسین کہتے ہیں۔ یہاں ایک چیز سمجھنے کی ہے' مشہور صوفی حسین ابن منصور حلاجؒ (922-857/309-244ھ) کی لکھی ہوئی کتاب کا نام کتاب الطواسین ہے۔ ''طواسین'' قرآنِ کریم کے مقطعات ''طٰس'' میں آتا ہے۔ منصور حلاجؒ نے اس ''طٰس'' کی جمع طواسین بنائی ہے۔ اور ''طواسین'' ان صوفیوں کے ہاں طورِ سینا کا مخفف ہے' ''ط'' طُور کے لیے ہے ''س'' سِینا کے لیے۔ تو طواسین ان کے نزدیک وہ مقام ٹھہرا جہاں خدا بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے۔ جہاں اس کی جلوہ فرمائی نہ بھی کہیں بے نقاب کہیے تو بھی بہرحال یہ اُن کے نزدیک وہ مقام ہے جہاں وہ گویا باتیں کرتا ہے۔ ان کے ہاں طواسین اس مقام کو کہتے ہیں جہاں خدا سے ہم کلامی ہوتی ہے اور اس کے جلوے سے نگاہیں فیض یاب ہوتی ہیں۔ تصوف میں ہر اس مقام کو جہاں خدا سے ہم کلامی ہو اور اس کے نور

سے‘ اس کے جلوے سے‘ نگاہیں لذت اندوز ہوں‘ اسے یہ طواسین کہتے ہیں۔

اقبالؒ نے آگے چار پیغمبروں کا ذکر کیا ہے اور انہیں ہر ایک کا ’’طس‘‘ کہا لہٰذا طواسین‘ ان چار پیغمبروں کے ’’طسینوں‘‘ کی جمع ہوگئی: طسینِ گوتم‘ طسینِ زرتشت‘ طسینِ مسیحؑ‘ طسینِ محمد ﷺ ۔ یہ چار طواسین آگے آئیں گے۔ طسین سے یہ مفہوم ٹھہرا۔ اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ طواسین کے یہ معنی ہیں۔

اب یہاں سے چلتے ہوئے راستے میں رومیؒ کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ہاں DRAMATIC TOUCH (ڈرامائی رنگ) خوب ہوتا ہے صاحب! وہاں تک پہنچنے سے پیشتر ’’اودوویں جنے ترے جان ڈ ئے ہوئے نیں‘ تے گلاں تے کرنیاں ہوندیاں نیں۔ دوویں شاعر نے گلاں وی کرنیاں ہوندیاں نیں‘ شاعری دیاں گلاں کرنیاں نیں ہور کی گلاں ایہناں نیں کرنیاں ہیگیاں نیں‘‘ (وہ دونوں نوجوان چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے باتیں بھی کرنی ہیں۔ یہ دونوں شاعر ہیں۔ انہوں نے باتیں بھی شاعری کی کرنی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا باتیں کریں!)۔

رومیؔ آں عشق و محبت را دلیل

(رومی جو عشق و محبت کی دلیل ہے)۔ دلیل کے لفظی معنی ہوتا ہے ’’راہنمائی کرنا‘ راستہ دکھانا‘‘۔ یہاں کہا ہے کہ عشق و محبت را دلیل یعنی عشق و محبت کی دلیل ہے۔

تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

(جس کا کلام پیاسوں کے لیے سلسبیل ہے)

اقبالؒ کے نزدیک شاعری کی تعریف

رومیؒ نے اقبالؒ سے پوچھا کہ شعر کیا ہوتا ہے؟ وہ شاعری کے متعلق باتیں کر رہا ہے۔ اقبالؒ نے اس حصے میں شاعری کے متعلق جو کچھ کہا کسی دوسری جگہ اتنی COMPREHENSIVE (جامعیت) کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ اقبالؒ یہاں اگرچہ زبان رومیؒ کہہ رہا ہے مگر بات ساری اپنی کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ

گفت ’’آں شعرے کہ آتش اندروست　　　اصلِ او از گرمئِ اللہ ھو ست!

(اقبالؒ نے رومیؒ سے کہا کہ شعر جس کے اندر سوز ہے اُس کی اصل ’’اللہ ھو‘‘ کی گرمی سے ہے) یعنی جب تک اللہ ھو کا وہی سوز شعر کے اندر نہ آئے گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ کہتا ہے کہ

آں نوا گلشن کند خاشاک را　　　آں نوا برہم زند افلاک را

آں نوا برحق گواہی می دہد　　　با فقیراں پادشاہی می دہد!

خوں ازو اندر بدن سیّار تر

(ایسی نوا خاشاک کو گلشن بنا دیتی ہے۔ ایسی نوا افلاک کو برہم کر دیتی ہے۔ ایسی شاعری حق پر گواہی دیتی ہے، وہ فقیروں کو شاہی عطا کرتی ہے۔ اس سے بدن کے اندر خون کی گردش زیادہ تیز ہوتی ہے)۔

وہ ستارے جو اپنے مقام پہ رہتے ہیں، ان کو ثوابت کہتے ہیں اور جو چلتے رہتے ہیں ان کو سیّار کہتے ہیں، تو یہ ہیں ثوابت و سیار۔ ہمارے اس دور میں، کتنے ہی سیارّوں کا اضافہ ہو گیا۔ سیارہ، جدید فارسی کے اندر، موٹر کار کو کہتے ہیں لیکن قدیم فارسی میں یہ ''سیار'' عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی یہ ستارے ہیں جو چلتے رہتے ہیں۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

(ضربِ کلیم: مہدی برحق)

مشرق کے ثوابت ہوں یا مغرب کے سیارّ، سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہیں۔ ''سروش'' اس کو ہم کلام کر سکتا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسے سروش اس کے ساتھ آ کر ہم کلام ہوا، بہت کم کسی کو یہ باتیں کہنا نصیب ہوئیں۔ بات کہنے کا یہ کس قدر خوبصورت انداز ہے!

(بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ)

خوں ازو اندر بدن سیّار تر قلب از روح الامیں بیدار تر

(اس سے بدن کے اندر خون کی گردش زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور قلب روح الامین سے زیادہ بیدار ہو جاتا ہے)۔

یہ روح الامین سے بھی زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس

اے بسا شاعر کہ از سحرِ ہنر رہزنِ قلب است و ابلیسِ نظر!

(اے کہ بہت سے شاعر اپنے سحر کے جادو سے دل کے رہزن اور نظر کے ابلیس بن جاتے ہیں) آہاہا! ''ابلیسِ نظر'' بہت اچھی ترکیب ہے۔ آگے کہا کہ

شاعرِ ہندی! خدایش یار باد جانِ او بے لذّتِ گفتار باد
عشق را خنیا گری آموختہ

(ہندوستان کا شاعر! خدا اس کا یار ہو۔ اس کی جان لذّتِ گفتار سے محروم ہو جائے۔ اس نے عشق کو راگ رنگ سکھا دیا ہے)۔

''اے کھسرے جس طراں گاوندے پھردے نیں ایس طراں دی موسیقی'' (جس طرح یہ ہیجڑے گاتے پھرتے ہیں یہ اس طرح کی موسیقی ہے) یعنی موسیقی کی یہ بازاری قسمیں ہوتی ہیں۔ خنیا گری کے معنی بازاریت لیے ہوئے موسیقی کے ہیں۔

عشق را خنیا گری آموختہ با خلیلاں آزری آموختہ!

(اس نے عشق کو راگ رنگ سکھا دیا، اُس نے خلیلوں کو آزری سکھا دی)۔ تُو جن کا کام بت شکنی تھا، ان کو بت گری سکھاتا ہے۔

حرفِ او چاویدہ و بے سوز و درد مُرد خوانند اہلِ درد اورا نہ مَرد

(اس کی شاعری کے الفاظ ''چاویدہ'' ہیں۔ اہل درد اسے مَرد نہیں مُردہ کہتے ہیں) لفظ ''چاویدہ'' دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے کو کہتے ہیں۔ یہ ہیں اس کی شاعری کے الفاظ۔ اہلِ درد اسے مُرد پڑھتے ہیں' وہ مرد ہوتا ہی نہیں ہے۔

زاں نوائے خوش کہ نشناسد مقام خوشتر آں حرفے کہ گوئی در منام

(ایسی اچھی لگنے والی شاعری سے' جو اپنے مقام کو نہیں پہچانتی' وہ بات بہتر ہے جو تو خواب کی حالت میں کرتا ہے یا بڑبڑاتا ہے)۔ ''زاں نوائے'' کے معنی ہیں خوشت جو مقام کو نہیں پہنچاتی۔ بتایا ہے کہ وہ حرف' وہ بات جو انسان خواب میں' نیند میں' بڑبڑا کر کہہ دیتا ہے' وہ اس نوا سے زیادہ بہتر ہے جو مقام کو نہیں پہچانتی۔

اقبالؒ کے ہاں رسول اکرم ﷺ کے مقامِ بلند کو بیان کرنے کا ایک لاثانی انداز

فطرتِ شاعر سراپا جستجوست خالق و پروردگارِ آرزوست!

(شاعر کی فطرت سراپا جستجو ہے' وہ آرزو کا خالق اور پروردگار ہے)۔ اسے یوں کہیے کہ یہ دونوں چیزیں خالق و پروردگارِ آرزو ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر اس نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا ہے:

خوں ازو اندر بدن سیّار تر قلب از روح الامیں بیدار تر
مقامش عبدہ آمد و لیکن
جہانِ عشق را پروردگارست

کیا بات ہے! حضور ﷺ کے متعلق جب یہ شخص بات کرتا ہے تو جن بلندیوں پہ پہنچتا ہے' کوئی اور وہاں نہیں پہنچتا۔ یہ ہے اقبالؒ کے ہاں رسولِ اکرم ﷺ کے مقامِ بلند کو بیان کرنے کا ایک لاثانی انداز۔

کائنات کی نقشبندی کے سلسلہ میں نفخ صور کی وضاحت

اب آگے کہتا ہے کہ

خوں ازو اندر بدن سیّار تر قلب از روح الامیں بیدار تر
شاعر اندر سینۂ ملتؔ چو دل
ملتیؔ بے شاعرے انبارِ گِل !
سوز و مستی نقشبندِ عالمے است

(شاعر تو ملت کے سینے میں دل کی طرح ہوتا ہے۔ شاعر کے بغیر ملت مٹی کا ڈھیر ہے۔ سوز و مستی ایک عالم کی نقشبند (FORM) ہے)۔ کائنات کی جتنی بھی نقشبندی (FORM) ہے' یہ سوز و مستی سے ہوتی ہے۔ اس کے اوپر نقش و نگار کرنا'

تزئین و آرائش کرنا اور اس کو ایک FORM (صورت) کے اندر لانا' یہ سب چیزیں نقشبندی میں آجاتی ہیں۔ اس کائنات کے لیے یہ سوز و مستی ہے' جس سے کائنات میں حسن پیدا ہوتا ہے' وہ ایک FORM (صورت) اختیار کرتی ہے۔ اس میں FORM (صورت) اختیار کرنے کی پہلی چیز بھی بڑی اہم ہے صاحب! کیوں کہ ارسطو (384-322 B.C.) کے فلسفہ کے اندر تو FORM (صورت) ہی ہے جو BASIS OF EXISTENCE (وجود کی اساس) ہے۔ یہ بات اس نے ٹھیک کہی ہے۔ ہم اس کو EXISTENCE (وجود) کہتے ہیں' جب کوئی چیز FORM (صورت) کے اندر آجاتی ہے۔ جب FORM (صورت) نہیں ہوتی تو ہم اس کو EXISTENCE (وجود) میں نہیں لاتے۔ یہ جتنا مادہ (MATTER) ہے یہ ہمارے ہاں PURE ENERGY (خالص توانائی) میں آتا ہے چونکہ یہ FORMLESS (بغیر صورت) ہوتا ہے اس لیے اس کو MATTER (مادہ) نہیں کہتے۔ اس نے EXISTENCE (وجود) کی جو DEFINITION (تعریف) کی تھی' وہ اس نے فارم کی کی تھی۔ قرآن نے تو هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (59:24) کہا ہے' اس کے معنی فارم دینے والا ہے' صَوَّرُ کے معنی ''فارم'' (FORM) ہوتا ہے۔ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ (18:99) قرآن میں جو صور ہے' وہ صورت کی طرح ہے یعنی پیکروں کے اندر نئی توانائی بخش دینا۔ یہ وہی چیز ہے جسے فارم (FORM) کہتے ہیں۔ صورت کی جمع صُور بھی آتی ہے اور میں نے اس نُفِخَ فِي الصُّوْرِ (18:99) کو یہ مفہوم دیا ہے جی! کہ یہ FORMS (صورتوں) کو' نئے پیکروں کے اندر ایک نئی قسم کی توانائی پھونکنا ہے' یہ نفخِ صور ہے۔

سوز و مستی نقشبندِ عالمے است

اگر سوز و مستی نہ ہو' تو یہ عالم' یہ کائنات' بالکل مٹی کا گھروندہ ہوتا ہے۔

شاعری بے سوز و مستی ماتمے است !

(سوز و مستی کے بغیر شاعری سوائے ماتم کرنے کے اور) کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ (مرزا اسداللہ خان) غالب (1797-1869) نے اس بات کو اچھے انداز میں کہا ہے۔

خوں ازو اندر بدن سیّار تر قلب از روح الامیں بیدار تر

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے

ایں ہا سخنِ نغز چہ گفتے چہ شنودے

(اگر عشق نہ ہو اور غمِ عشق نہ ہو تو پھر یہ اعلیٰ وارفع' سخن کیا سنیے!) واہ واہ واہ واہ!

خوں ازو اندر بدن سیّار تر قلب از روح الامیں بیدار تر

شاعری بے سوز و مستی ماتم است !
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است‘‘

(سوز و مستی کے بغیر شاعری سوائے ماتم کدہ کے اور کچھ بھی نہیں۔ شعر کا مقصود اگر آدم گری ہے تو شاعری بھی پیغمبری کی وارث ہے)۔ یہ بہت اچھا شعر ہے کہ مقصودِ شاعری اگر آدم گری ہے تو پیغمبری ہے۔ یہ اس نے پیغمبری کی بات کہی ہے۔ آگے کہا کہ

خوں ازو اندر بدن سیّار تر قلب از روح الامیں بیدار تر
گفتم از پیغمبری ہم باز گوے
سرِّ او با مردِ محرم باز گوے

(میں نے کہا: پیغمبری کے بارے میں دوبارہ کہیے۔ راز سے محروم مرد کے لیے اس کا بھید پھر بیان کیجیے)۔ اب سوال یہ ہے کہ پیغمبری کیا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے؟

امت ہمیشہ رسول کی نسبت سے متعین ہو پاتی ہے‘ صرف خدا کو ماننے سے نہیں بنتی

گفت ’’اقوام و ملل آیاتِ اوست

(اس نے کہا کہ قومیں اور ملّتیں اس کی آیات (نشانیاں) ہیں)۔ اس کو وحی کہہ لیجیے‘ رسالت کہہ لیجیے‘ نبوت کہہ لیجیے‘ یہ ایک ہی بات ہے جی۔

’’اقوام و ملل آیاتِ اوست‘‘ یہ کیا بات کہہ گیا صاحب! یہ بڑی اہم بات ہے جو اس نے اس کے اندر کہی ہے کہ خدا کے ماننے سے قوم نہیں بنتی‘ قوم ہمیشہ رسول کے ماننے سے بنتی ہے۔ قوم رسول کی طرف نسبت کرنے سے متعین ہوتی ہے۔ دین میں جو صرف خدا کا ماننا ہے‘ اس سے امت نہیں بنتی‘ امت کسی نبی کے ماننے سے بنتی ہے‘ اس کی نسبت اس نبی کی طرف ہوتی ہے تب وہ اس نبی کی امت کہلاتی ہے۔ اور اسی میں جو آپ کے ہاں مرزائیت کا مسئلہ ہے‘ وہ حل ہو جاتا ہے۔ پچھلے تمام انبیا بنی اسرائیل کو مانتے چلے آئے‘ عیسائیوں نے حضرتِ عیسیٰؑ کو نبی مانا تو یہ عیسائی ہو گئے‘ باقیوں سے الگ ہٹ گئے۔ امت اس آخری نبی سے بنتی ہے جس کو کوئی قوم مانتی ہو۔ جس کو کوئی قوم آخری نبی مانتی ہے اس کی طرف نسبت کرنے سے وہ اس کی امت بنتی ہے۔ پہلے انبیائے کرامؑ پر ان کا ایمان ہوتا ہے لیکن وہ ان کی امت نہیں بنتی۔ امت اس نبی کی بنتی ہے جو انبیائے کرام کے سلسلے میں آخری نبی مانا جائے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ تک مانتا ہے‘ رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتا۔ جس دن وہ حضرتِ عیسیٰؑ کے بعد اسی کڑی کے اندر رسول اللہ ﷺ کو مانتا ہے‘ عیسائی نہیں رہتا‘ وہ امتِ محمدیہ ﷺ میں آ جاتا

ہے کیوں کہ اس سلسلے میں' اس نے یہ آخری نبی مانا ہے۔ لہٰذا سلسلۂ انبیا میں آخری نبی کی طرف اپنی نسبت کرنے سے امت بنتی ہے۔ یہ ہوا جی مسلمہ۔

اب اس کے بعد سیدھی سی بات ہے' مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو نبی ماننے والا ایسا ہی ہے' جس طرح سے عیسائی رسول اللہ ﷺ کو ماننے کے بعد عیسائی نہیں رہتا' وہ محمدی ﷺ ہو جاتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اگر کوئی کسی اور کو نبی مانتا ہے تو پھر وہ محمدی ﷺ نہیں رہتا' وہ اس نئے نبی کی امت ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر یہ مرزا (غلام احمد قادیانی: 1908-1835) کو نبی مانتے ہیں تو یہ مسلمانوں کا فرقہ نہیں رہ سکتے' یہ ایک نئی امت بن گئے ہیں۔ کیوں کہ جو امت بنتی ہے وہ نبی کی نسبت سے بنتی ہے۔ انبیائے کرام میں سلسلہ جس نبی پہ آ کر رک جائے تو اسی کی نسبت سے ہمیشہ وہ امت بنتی ہے۔ ''اقوام وملل آیاتِ اوست'' ہیں' اس لحاظ سے قوم ملت پیغمبر کی نشانی ہوتی ہے۔ یہ اقبالؒ بڑی گہری باتیں کر جاتا ہے صاحب!

نبی کی شخصیت وحی کی روشنی میں انسانوں کو شخصیت سازی کے اصولوں سے آگاہ کرتی ہے اور اس طرح انسانوں کا یہ گروہ اس کی امت کہلاتا ہے

عصر ہائے ما ز مخلوقاتِ اوست

(ہمارے زمانے اس کی مخلوقات میں سے ہیں)۔

نبی جن چیزوں کی تخلیق کرتا ہے' جو IDEAS دیتا ہے' جس طرح زمانے کو اپنے پیغام کے مطابق ڈھالتا ہے' وہ ہمارا زمانہ ہے اور ہمارا عہد اس سے بنتا ہے' یہ اس کی اگائی ہوئی کھیتی ہے۔ یہ وہی ہے جسے ہم اپنی شناخت کہتے ہیں' اس سے ہماری شخصیت بنتی ہے۔

از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت

(اس کے دم سے اینٹیں اور پتھر قوتِ گویائی پیدا کر لیتے ہیں)

یعنی اینٹوں اور پتھروں جیسی بے زبانوں کو وہ زبانیں عطا کر دیتا ہے۔

ما ہمہ مانندِ حاصل او چو کشت !

(ہم سب حاصل کی مانند ہیں اور وہ کھیتی ہے)'

اس کی اُگائی ہوئی یہ ساری کھیتی ہوتی ہے جس کا حاصل پھر یہ امت کہلاتی ہے۔

پاک سازد استخوان و ریشہ را

(وہ ہڈیوں اور ریشوں کو پاک بنا دیتا ہے)

دیکھیے صاحب! دوشعروں کے اندر یہ شخص کس خوبصورتی سے قرآن کی طرف لے گیا ہے! اور انہی دوشعروں میں سارا قرآن سمو گیا۔ یہ بڑے اہم شعر ہیں۔

نبی کی عطا کردہ فکر انسانی تصورات کو فلک بوس بلندیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے

بالِ جبریلے دہد اندیشہ را

(وہ فکر کو جبریل کے بازو دیتا ہے)۔ یہ فکر اور طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) دو ہی چیزیں ہیں۔ PHYSICAL LIFE (طبعی زندگی) کے متعلق تو کہا ہے کہ

پاک سازد استخوان و ریشہ را

(وہ ہڈیوں اور ریشوں کو پاک بنا دیتا ہے)۔ اسے یوں سمجھیے کہ PHYSICAL LIFE (جسمانی زندگی) وحی اس کو بھی پاکیزہ بنا دیتی ہے اور انسانی IDEALISM (مثالیتؔ) یا فکر اس کو جبریل کا پر عطا کر دیتی ہے تاکہ فکرِ انسانی جہاں تک جی چاہے اڑتی ہوئی چلی جائے۔ یعنی اس سے زیادہ جامعیت کے ساتھ کیسے کہے کہ قرآن کیا کرتا ہے۔ کیا بات ہے صاحب! قرآن نے رسول کے متعلق کہا ہے کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ (7:157) وہ اس قوم کے لیے طیّبات کی رسیاں کھول دیتا ہے۔

پاک سازد استخوان و ریشہ را

اور اسے اس زندگی تک محدود نہیں رکھتا کہ یہ فقط PHYSICAL LIFE (طبعی زندگی) ہے، وہ یہ زندگی بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ انسان کو فکر بھی دیتا ہے، نیز اس کے اندیشے کو بالِ جبریل بھی عطا کرتا ہے۔ یہ وہ مقامات جہاں اقبالؒ نظر آتا ہے کہ یہ کیا ہے!

ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات

اندرونِ کائنات جس قدر انقلابات آئیں، وہ آپ کے اندر بھی آتے ہیں۔ ''ہائے وہو'' کے معنی ''اضطراب انگیزیاں'' ہیں۔ انہیں آپ انقلابات کہیے۔

ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات

یعنی باہر آنے والے انقلابات کچھ بھی نہیں ہوتے۔ انقلاب تو درحقیقت وہ ہوتے ہیں جو رگِ کائنات کے اندر غیر محسوس طور پر بنتے چلے جاتے ہیں، جب وہ مشہود طور پہ سامنے آتے ہیں تو انہیں ساری دنیا دیکھتی ہے۔

ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات از لبِ او نجمؔ و نورؔ و نازعاتؔ

(کائنات کے اندر ہر قسم کے ہنگامے آتے ہیں۔ وہ اس کے لب سے نکلی ہوئی النجم، النور اور النّٰزعٰت کی قرآنی سورتوں

کی وجہ سے ہیں)۔ النجم، النور اور النزٰعٰت تینوں ہی قرآن کی سورتوں کے نام ہیں۔ آپ نے خوبصورتی کو دیکھا ہے کہ کتنی عمدہ ہے! ''ازلبِ او'' یعنی وہ الفاظ اس کے نہیں ہوتے، وہ صرف ان کو پکارتا ہے۔

آفتابش را زوالے نیست نیست   منکرِ او را کمالے نیست نیست

(اس کے سورج کو زوال نہیں ہے، نہیں ہے۔ اس کے انکار کرنے والے کو کمال حاصل نہیں ہے، نہیں ہے)۔ واہ واہ واہ واہ! اے اقبالؒ! اللہ تیری روح پہ کروٹ کروٹ رحمتیں نازل کرے۔ کیا بات کر گیا صاحب! POSITIVE (مثبت) اور NEGATIVE (منفی) دونوں چیزیں اس میں آگئیں: ''آفتابش راز والے نیست نیست'' میں ''نیست و نیست'' کی تکرار کتنی عجیب ہے اور ''منکرِ او را کمالے نیست نیست'' میں بھی۔

رحمتِ حق صحبتِ احرارِ او   قہرِ یزداں ضربتِ کرّارِ او

اللہ اکبر! اس کی صحبت تو بہت بڑی چیز ہوگی، اس کے صحابہؓ کی صحبت ہی رحمت ہے۔ ہمارے ہاں ''کروفر'' کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ جو ''کر'' اور ''فر'' تھا، یہ عربوں کے ہاں جنگ کی دو STRATEGIES (حکمت عملیاں) ہوتی تھیں، ان کے ہاں دو قسم کی جنگیں ہوتی تھیں۔ ''فر'' حملہ کرنے کے بعد واپس لوٹ آنا، یہ ''فرار'' ہوتی لہٰذا ''فر'' تو فرار سے ہے۔ اور ان کے ہاں ''کر'' ہوتی تھی کہ تکرار سے جنگ کرتے چلے جانا، کرتے چلے جانا، اس کو ضربِ پیہم کہتے ہیں، وہ ''کر'' ہوتی ہے۔ اس لیے ''کر'' ''تکرار'' سے ہے۔ اور ایک دفعہ حملہ کر کے واپس لوٹ آنا ہے، وہ ''فر'' ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں ''کروفر'' کے معنی تو شان و شوکت کے ہیں اور ہم کروفر کو شان و شوکت کے معنوں میں ہی لیتے ہیں۔ چناں چہ بسا اوقات الفاظ اپنے صحیح معنوں سے دور ہٹ جاتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں کروفر کے الفاظ دوسرے معنی میں رائج ہیں۔ ان کے ہاں یہ دو قسم کی جنگیں ہوتی تھیں۔ ''ضربتِ کرار'' کے معنی ہوتے ہیں ''ایسی ضرب جو پیہم لگاتے ہوئے، بڑھتے چلے جائیں، پیچھے نہ لوٹیں''۔

انسانی عقل خواہ کتنی بلند ہو جائے وحی کی روشنی کی پھر بھی محتاج رہے گی

گرچہ باشی عقلِ کل از وے مرم

(اگر تو عقلِ کل بھی ہے تب بھی اُس سے دور نہ بھاگ)

مرم کے معنی ہیں مت بھاگ، مت دور جا۔ رمیدن کے معنی بھاگنا ہے، وہاں سے رم امر ہے اور مرم نہی ہے۔ کہا کہ اگرچہ تُو عقلِ کل ہو جائے لیکن پھر بھی اُس سے دور نہ بھاگ۔

زانکہ او بیند تن و جاں را بہم

(تن اور جان یا دنیا اور دین کو الگ الگ نہ دیکھ، الگ الگ نہ رکھ)

یہ DUALISM (ثنویت) کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر تو عقلِ کل ہو گیا تو تُو تن ہی کو دیکھے گا' جو محسوسات کی دنیا ہے تُو صرف اسی کو دیکھے گا لیکن اگر تُو اس وحی' رسالت کے ساتھ رہے گا تو تن اور جاں تیرے ساتھ ہو جائیں گے' ان کو بہم ایک ہی جگہ اکٹھا کیا ہوا ہو گا۔ آپ نے اس LOGIC (منطق) کو دیکھا کہ عقلِ کل ہونے کے باوجود کیوں ضرورت ہے کہ رسالت اور وحی کا دامن پکڑا رہے؟ اس لیے کہ عقلِ کل محسوسات اور مفردات تک رہے گی اس لیے

تیز تر نہِ پا براہ یرغمیدؔ

(وادیٔ یرغمید کے راستے میں تیز قدم رکھ)۔ اس نے کہا کہ ''اوا پنے کمّاں نوں لگ گئے۔ اسی تے اواُڈنا ہیگا' اوچھیتی ذرا اڈّی چک کے اگاں نوں' بڑا دور جانا ہیگا'' (تم تو اپنے ہی کام کاج میں جُت گئے۔ ہمیں تو اڑنا ہے۔ ذرا جلدی آگے کو قدم بڑھاؤ' مسافت لمبی ہے' دور جانا ہے)۔

مادی دنیا میں اخلاقیات کی اہمیت اور اس کے خدوخال کی وضاحت کرنا نبوت ہی کا خاصہ ہے

کہا ہے کہ

تا بہ بینی آنچہ می بایست دید

(تا کہ تُو وہ کچھ دیکھ سکے جو کچھ دیکھنا چاہیے)

یہ OUGHT (چاہیے) کے معنی ہوئے کہ جو دیکھنا چاہیے' وہ چل کر دیکھیں۔ میں یہ عرض کر دوں کہ اقبالؒ جو ''بایست'' لایا ہے وہ یہ ہے کہ ETHICS کا یہ سارا قصہ OUGHT (چاہیے) سے ہے یعنی ''جو ہونا چاہیے''۔ یہ جو WHAT IS (کیا ہے) ہے' اس کا سارا تعلق سائنٹفک ورلڈ (دنیائے سائنس) سے ہوتا ہے اور جو WHAT OUGHT TO BE (کیا ہونا چاہیے) ہے' اس کا تعلق ETHICS (علم اخلاق) سے ہوتا ہے کہ ''ہونا چاہیے''۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ''بایست'' کہا جاتا ہے: ''کیا ہونا چاہیے''۔ لفظوں کی خوبصورتی دیکھیے! اقبالؒ یوں ہی لفظ ادا نہیں کر جاتا۔ وحی کی دنیا میں' رسالت کی دنیا میں' طواسینِ نبوت میں جا رہا ہے۔ طواسینِ نبوت میں کیا نظر آتا ہے؟ باقی جگہ میں جو کچھ بھی ہے یہاں یہ نظر آتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ درحقیقت ''ہونا کیا چاہیے''؟ کہتا ہے کہ جو دیکھنا ہے اس کے لیے نبوت کی طرف چل' وہاں نظر آئے گا کہ ''ہونا کیا چاہیے''۔ بڑی عمدہ چیز ہے صاحب! WHAT IS (کیا ہے) تو عام آنکھوں سے نظر آ جاتا ہے' لیکن WHAT OUGHT TO BE (کیا ہونا چاہیے) ہے' وہ انسان کو صرف نبوت کے ہاں جا کر نظر آتا ہے اس لیے وہاں جلدی چل تا کہ جو کچھ ہونا چاہیے' اسے ہم دیکھیں۔

کندہ بر دیوارے از سنگِ قمر چار طاسینِ نبوّت را نگر''

(وہاں وادیِٔ یرغمید میں چاند کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک دیوار پر کندہ کیے ہوئے نبوت کے چار طاسین دیکھ)۔

چل بھئی! قمر کی پہاڑ کی دیوار کے اوپر سنگ مرمر سے لکھا ہوا ہوگا: چار طاسین تختیاں۔ اب یہ دیکھیے کہ اس میں احترام بھی ملحوظ رکھتا ہے' یہ ان نبیوں کو جا کر نہیں مل رہا بلکہ' ان کے جو طاسین ہیں' یہ ان کے نزدیک جاتا ہے۔ ہوسکتا تھا کہ یہ گوتم' زرتشت' مسیح کو غالباً مل لیتا' آگے مقام بڑا نازک آتا تھا اس لیے فوراً اس نے سوچا کہ ان کو نہیں ملے گا' جب آگے چلے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے علاوہ انسانوں کو جا کر ملتا ہے لیکن یہاں نبوت کی بات ہے تو ان نبیوں کو نہیں مل رہا' بلکہ ان کے طاسین میں آ کر کھڑا ہو جائے گا۔

کندہ بر دیوارے از سنگِ قمر چار طاسینِ نبوّت را نگر''

چاند کے پتھروں پہ کندہ تختیوں کو جا کر پڑھو۔ ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے ادب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ اُن سے مل نہیں رہا اور یہ اسی لیے ہے کہ ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے متعلق کیا کہوں۔

شوق راہ خویش داند بے دلیل

جو شوق ہے وہ تو کسی راستہ دکھانے والے یا کسی نشاناتِ راہ دکھانے والے کے بغیر بھی اپنا راستہ جانتا ہے۔

شوقِ پروازے ببال جبرئیل !

واہ واہ واہ! (شوق جبریل کے پروں کے ساتھ پرواز کا نام ہے)۔

شوق را راہِ دراز آمد دو گام این مسافر خستہ گردد از مقام

(شوق کے لیے لمبا راستہ دو قدم ہوتا ہے۔ ایسا مسافر مقام پہ ٹھہرنے سے خستہ ہو جاتا ہے)

اگر اُسے ٹھہرنا پڑے' تو اُسے ٹھہرنے سے آرام نہیں پڑتا' وہ اور تھک جاتا ہے۔ یہ اس قسم کا مسافر ہے یا اقبالؒ ہی کے الفاظ میں:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(بالِ جبریل)

غالب کی شاعری بھی اپنے ہاں ایک عجیب تاثر پیدا کرتی ہے

یہ ہے ''شوق را راہِ دراز آمد دو گام'' (شوق کے لیے لمبا راستہ دو قدم ہوتا ہے)۔ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869) اس سے بہت آگے جاتا ہے۔ یہ اس کا بڑا گہرا شعر ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے تو دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دیکھتے ہیں ڈاکٹر❶ صاحب! کیا بات کہتا ہے یہ شخص!

یہ سارا دشتِ امکاں، یہ THE ENTIRE UNIVERSE (کل کائنات) ایک نقشِ پا ہے۔

ہاں تو کہا تھا کہ

شوق را راہِ دراز آمد دو گام ایں مسافر خستہ گردد از مقام

پا زدم مستانہ سوئے یرغمیدؔ تا بلندیہائے او آمد پدید

(شوق کے لیے لمبا راستہ (صرف) دو قدم ہوتا ہے۔ ایسا مسافر مقام (ٹھہرنے) سے خستہ ہو جاتا ہے۔ میں نے وادیٔ یرغمید کی طرف مستانہ قدم بڑھایا تا آنکہ اس کی بلندیاں ظاہر ہونے لگیں) یعنی دور سے اس کی چوٹیاں نظر آنے لگ گئیں۔

من چہ گویم از شکوہِ آں مقام ہفت کوکب در طوافِ او مدام

(میں اس مقام کے شکوہ کے متعلق کیا کہوں۔ اس کے طواف میں ہمیشہ سات ستارے رہتے ہیں)۔ یہ SEVEN PLANETS (سات سیارے) ہیں، یہ تو اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔

فرشیاں از نورِ او روشن ضمیر عرشیاں از سرمۂ خاکش بصیر!

حق مرا چشم و دل و گفتار داد

(فرش پر رہنے والے اس کے نور سے روشن ضمیر اور عرش والے اس کی خاک کے سرمہ سے بینا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آنکھ، دل اور گفتار عطا کر دی)۔ صاحب! مقام بھی تو نبوت کا آ رہا ہے، یہ کیوں نہ ایسا کہے گا۔

حق مرا چشم و دل و گفتار داد جستجوئے عالمِ اسرار داد

پردہ را بر گیرم از اسرارِ کل با تو گویم از طواسینِ رُسُل

(اللہ تعالیٰ نے مجھے آنکھ، دل اور گفتار عطا کر دی۔ مجھ میں عالمِ اسرار کی جستجو پیدا کر دی۔ میں اسرارِ کل سے پردہ اٹھاتا ہوں اور تجھے رسولوں کے طاسینوں کی بابت بتاتا ہوں)۔ اب یہ اسرارِ کل سے جلوہ کشائی کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ میں پہنچ کہاں رہا ہوں: طواسینِ رسل میں پہنچ رہا ہوں صاحب! اب میں اونچی باتیں کروں گا۔

آگے بات بہت لمبی چلی جائے گی۔ ہمارے سامنے چاروں طواسین آئیں گے۔ پہلے ہے طاسینِ گوتم، پھر طاسینِ زرتشت، اور طاسینِ مسیح، اور پھر طاسینِ محمد ﷺ ہے۔ یہ چاروں طواسین ہم آئندہ دیکھیں گے۔

آج ہم ''جاوید نامہ'' کے 47ویں صفحے تک آ گئے۔ آئندہ ہم طاسینِ گوتم سے شروع کریں گے۔

---

❶ یہ اشارہ سید عبدالودود 2001-1908ء کی طرف ہے۔ محترم موصوفؒ پرویزؒ کے ذاتی معالج بھی تھے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمائیے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546
idarati@gmail.com

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری ندوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صحت احادیث کا ایک خاص معیار

ابوحمید اور ابو اسید دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں کہ:

اذا سمتعم الحدیث عنی تعرفہ قلوبکم و تلین لہ اشعار کم و ابشار کم و ترون انہ منکم قریب فانا اولا کم بہ۔ واذا سمعتم الحدیث عنی تنکرہ قلوبکم وتنفر اشعارکم وابشارکم منہ وترون انہ منکم بعید فانا ابعد کم منہ۔ (رواہ احمد والبزار)

''جب تم مجھ سے مروی کوئی ایسی بات سنو جو تمہارے دل کو لگے اور اس سے تمہارے بال وجلد میں نرمی پیدا ہو اور یہ محسوس ہو کہ وہ تم سے قریب ہے تو سمجھ لو کہ میں اس بات کے کہنے کا تم سے زیادہ حق دار ہوں' اور جب کوئی ایسی روایت میری طرف منسوب ہو جسے سن کر تمہارے دل قبول نہ کریں اور بال وجلد میں گریز سا پیدا ہو اور وہ تم سے دُور محسوس ہو تو میں اس سے تمہاری نسبت زیادہ دُور ہوں۔''

ہم نے ترجمہ تو کر دیا ہے لیکن یہ ایسا ترجمہ نہیں جس سے مفہوم پوری طرح واضح ہو سکے۔ اس کے لیے چند خاص ٹکڑوں کا مفہوم سمجھ لینا بہت ضروری ہے:

1- روایت کے دو ٹکڑے ہیں اور اول کا ہر جزو دوسرے کا نقیض ہے۔ مثلاً:

تعرفہ قلوبکم ..... تنکرہ قلوبکم

تلین لہ اشعار کم ..... تنفر اشعار کم

انہ منکم قریب ..... انہ منکم بعید

اس تقابل سے معنی کی وضاحت یوں ہوگی کہ ایک میں جو معنی ہوں گے' دوسرے میں اس کی ضد ہوگی۔

2- ان تینوں ٹکڑوں کے الفاظ ایک خاص نفسی کیفیت کے اظہار کے لیے ہیں۔ تعرفہ قلوبکم کے معنی وہی ہیں جسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ دل کو لگتی ہے۔ پس تنکرہ قلوبکم کا مطلب یہ ہوگا کہ جو دل کو نہ لگے اور دل اس سے ابا و گریز کرے۔ اسی طرح تلین لہ اشعار کم وابشار کم کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ اس بات کو سن کر بال اور جلد نرم پڑ جائیں' یعنی سننے والے کی روح میں ایک ایسی کیفیت سوز و گداز پیدا ہو جو اس کے چہرے بشرے سے نمایاں ہو (اسی طرح

کی ایک دوسری کیفیت یہ ہے جسے قرآن نے تقشعر منه جلود ... الخ کہا ہے یعنی قرآن سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں)۔ آگے جو تنفر اشعار کم وابشار کم کہا گیا ہے اسے اسی کیفیت کی نقیض سمجھنا چاہیے۔ پھر انه منکم قریب کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ وہ تم سے قریب ہے لیکن یہ بھی ایک نفسی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہاں قرب سے مکانی قرب مراد نہیں بلکہ ذوقی قرب مقصود ہے، یعنی ذوقِ سلیم اس بات کو اپنے آپ سے قریب محسوس کرے۔ یہ ذوق علم، عقل، تدبر، ایمان اور تقویٰ وغیرہ کی ایک مجموعی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس حدیث کے مفہوم کو ہم یوں ادا کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث سننے کے بعد دل کو لگتی ہو یعنی دل پکار اُٹھے کہ واقعی یہ فرمانِ رسول ہے اور اسے سننے کے بعد دل میں گداز محسوس ہو اور نیز ذوقِ سلیم بھی اسے قبول کر لے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ حدیث واقعی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کے برعکس اگر دل کو اس کا مضمون نہ لگے اور دل کے اندر کوئی خاص کشش یا گداز بھی محسوس نہ ہو اور پھر ذوقِ سلیم بھی اسے قبول نہ کرے، تو یہ باور کر لینا چاہئے کہ وہ حدیث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی نے یوں ہی منسوب کر دی ہے۔

احادیث کی صحت کے لئے محدثین نے جو معیار مقرر کیے ہیں ان میں سند اور متن دونوں کے لئے شرطیں موجود ہیں لیکن حدیث کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس کی سند بالکل ٹھیک ہوتی ہے اور متن میں بھی کوئی نقص نہیں ہوتا لیکن اندر سے دل کہتا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ محدثین ایسی حدیث کو ''معلل'' کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسوٹی یہی مضمونِ حدیث ہے جس کو ہم پیش کر رہے ہیں اور کیا عجب کہ حدیث معلل کا وجود اسی روایت سے ہوا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ایک بات کسی کے دل کو لگتی ہے اور دوسرے کے دل کو نہیں لگتی، ایک کے اشعار وابشار میں لینت پیدا ہوتی ہے دوسرے کے نہیں ہوتی، ایک کسی بات کو اپنے ذوق سے قریب محسوس کرتا ہے اور دوسرا نہیں کرتا اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک دَور کا ذوق کسی بات کو قبول کرتا ہے اور دوسرے دَور میں قابل قبول نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص ایک بات کو آج بہت اہم سمجھتا ہو اور کل اس کا خیال بدل جاتا ہے۔ یہ سب باتیں ٹھیک ہیں، اس کے باوجود جو معیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے وہ صحیح ہے کیونکہ اس قسم کے اختلافات تو ہر فن میں، ہر مسئلے میں، ہر بات میں ممکن ہیں لیکن بہر حال اس کے باوجود دنیا میں ''مسلمات'' کا وجود بھی ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ کسی حدیث کو اس معیار کے مطابق اختلافِ اذواق کے باوجود کس طرح پرکھا جائے، تو سر دست اس کے لئے چند باتیں پیش نظر رکھنا بہت مفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

1- کسی ایسی حدیث / روایت کو صحیح نہ ماننا چاہئے جس سے قرآن کے ناقص یا محرف یا مبدل یا غیر محفوظ ہونے کا ثبوت ملتا ہو۔

2- کسی ایسی حدیث / روایت کو درست نہ تسلیم کرنا چاہئے جس سے کسی پیغمبر کے اعلیٰ کردار یا اصل تعلیم پر حرف آتا

ہو۔

3- کسی ایسی حدیث/ روایت کو تسلیم نہ کرنا چاہئے جو بداہت کے خلاف ہو یا عقل کے مطابق نہ ہو۔

4- کسی ایسی روایت کو نہ ماننا چاہئے جو قرآن کے کسی مضمون سے متناقض ہو۔

5- کسی ایسی روایت کو ٹھیک نہ سمجھنا چاہئے جو اسلام کی ہمہ گیری و آفاقیت کو ختم کرتی ہو۔

6- کسی ایسی روایت کو صحیح نہ تسلیم کر لینا چاہئے جو عدل، حکمت، رحمتِ عامہ یا رواداری کے خلاف ہو۔ وغیرہ وغیرہ

اس میں شک نہیں کہ قریب قریب یہ سب شرطیں محدثین اور اصولیین کے پیش نظر تھیں، اس لئے انہوں نے لاکھوں میں سے چند ہزار حدیثیں قبول کیں اور باقی رَد کر دیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی اس احتیاط کے باوجود ہنوز ہمارے ذخائر روایات میں ان سب اقسام کی روایات موجود ہیں، ان پر بڑے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ ہمارے دل میں بار بار یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ ایک مجموعہ تیار کیا جائے جس میں تمام وہ روایات یک جا کر دی جائیں جو اگرچہ کتب احادیث میں موجود ہیں لیکن وہ یقیناً محل نظر ہیں، اس کے ساتھ ان کے نا قابل قبول ہونے کی معقول وجوہ بھی درج کر دی جائیں۔

ہمارا ایک مجموعہ ''ریاض السنۃ'' تو شائع ہو چکا ہے۔ جس میں تمام وہ منتخب احادیث جمع کر دی ہیں جن کو عقل سلیم رَد نہیں کرے گی، لیکن ضرورت ایک ایسے مجموعے کی بھی ہے جس میں نا قابل قبول روایات درج کر دی جائیں۔

حدیث کی صحت کو پرکھنے کے لئے اوپر جس حدیث کو پیش کیا گیا ہے اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث بھی ہے جسے یہاں درج کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ماجاء کم عنی من خیر قلتہ اولم اقلہ فانا اقولہ، وما اتاکم من شر فانی لا اقول الشر۔ (رواہ احمد والبزار بلین)

یعنی میری طرف منسوب ہو کر تمہارے پاس کوئی کلمۂ خیر پہنچے تو خواہ میں نے وہ کہا ہو یا نہ کہا (مگر تم سمجھ لو کہ) وہ میں ہی کہہ رہا ہوں اور اگر کوئی کلمۂ شر پہنچے تو میں کوئی شر کی بات کہا ہی نہیں کرتا۔

اِس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس روایت میں شر کا کوئی غالب پہلو نکلتا ہو وہ خواہ کسی کتاب میں ہو اور اس کی سند و متن خواہ کیسے ہی ہوں، وہ یقیناً غلط منسوب ہوئی ہے۔ مثلاً اگر کسی روایت سے یہ معلوم ہو کہ فلاں سورہ میں اتنی آیتیں تھیں مگر اب اتنی رہ گئی ہیں تو اس کو قطعاً غلط سمجھنا چاہئے کیونکہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن پاک محفوظ نہیں۔ اسی پر باقی اقسام کو بھی قیاس کر لیجئے۔

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) –

Message to Fellow-Seekers

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1957)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

Opposition since last year

This is what the enemies of Tulu-e-Islam decided to do last year. It has been brought to my attention by different Bazms that they have come to Tulu-e-Islam posing as friends and well-wishers but their intention is to harm this movement from inside. You all know that we have nothing hidden that they want to steal it. Everything we do and write is out into the open. We are not concerned about them stealing our secrets because we *have* no secrets. So, what are they here for? Why have they joined you? Well, they want to create internal chaos in our collective peace. They want to sow the seeds of doubts and suspicions among us. They want to entangle you in abstract discussions. They want to engage in religious debates and trivial hairsplitting so that you cannot focus on your programs and actions. They try their best that this organized effort somehow acquires the form of a party. This they do within this movement. But when they go outside they engage in distortion and propaganda against Tulu-e-Islam's teachings, its message and its thought. People believe their maleficence because they think that they are inside members of the Tulu-e-Islam family. This is the biggest harm that comes to Tulu-e-Islam from such people.

Ignorant friends

That is one group that comes to Tulu-e-Islam with the intention of purposefully harming it. But a bigger threat comes to it from its naïve friends who have good intentions but get easily carried away by such propaganda and become tools in the hands of the first group. You can investigate and single out those enemies who deliberately join Tulu-e-Islam in order to harm it; but what can you say about its ignorant friends who become tools of destruction in the hands of the scheming ones?

A revolutionary movement – whose mission is to bring about change in people's thoughts and minds – needs to be extra careful in the initial phase of the call from such a danger. The Quran has suggested تعوذ (*Ta'oodh*) for such a situation: قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ (113:1) – The stage which this revolution is now entering is likely to produce a clash with the opposing forces. You thus have to be very careful: Just like how a new-born baby needs its mother's company for protection, you should tell your followers that they should take refuge under Allah's universal system of sustenance, whose Law of creation and evolution stipulates that something new always results from the clash of positive (constructive) and destructive forces. When the seed bursts then the plant emerges. قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114:1) – To achieve the objective mentioned above we should come closer to the Divine Law which provides for the nourishment of the whole of humanity (and not of a particular group of people or tribe). He is the

Sustainer of the whole world (1:1). Did you notice my friends what prescription the Quran prescribes to protect a new-born movement from dangers lurking in the shadows? It tells its sincere members of the movement to remain close to the center of its thought and system. In case of any danger they should immediately come under the protection of the center; and refer any issue to the center for receiving advice and guidance.

Remedy

This is explained in Surah Al-Nisa thus: وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا (4:83) – These people are not habituated to a disciplined life. Whenever they hear any news of peace or danger they broadcast it directly. Had they brought the news to the notice of the Prophet (PBUH) or the local authority, those who have been charged with the responsibility of scrutinizing news would have found out the truth. Were it not for Allah's goodness towards you, the majority amongst you would have followed the Devil.

Keeping the above critical instruction of the Quran regarding this issue in mind, I have decided to lay down a framework of guidance and a code of conduct for Bazm members; so that sincere fellow-travelers accompanying us on this journey may be able to get proper direction. These instructions will serve as constitution and bylaws for all the Bazms. I request you to please go through this document of guidance carefully. Those who agree with this guidance they should consider themselves as members of Tulu-e-Islam. Those who disagree with it and think that this unduly constrains their activities should find a different outlet for their activities. Tulu-e-Islam does not have monopoly on Quranic thought and actions. Those who have the passion and the energy for this work they can find whatever channel is suitable to them for realizing their goals and ambitions. But you will agree with me that, for anyone who wants to remain associated with Tulu-e-Islam, it is necessary that he/she must abide by its code of conduct and guidance. It will not be acceptable that one remains associated with Tulu-e-Islam and engages in ideologies and activities contrary to its code of conduct and its guidelines.

***

My dear brothers, whatever I had to say I have said it. I am thankful to you that you have attentively listened to my request with deep interest and great passion. In the end I want to express my heart-felt thanks to Allah for providing me with sincere friends like you. It is a fact that, in the journey of life, having a true friend lessens the difficulties of the way and brings the destination closer and closer. Your friendship, if I recall these past years, has made my desires younger; my courage loftier; my intentions stronger; my life full of beautiful spring; and my dying worthwhile. I feel Allah has done favor and says:– Be Alive with full spirit! Who knows my ideas – which I thought were no more than lovely fragrant dreams of shining silent stories of my deep imaginations – could turn into the form of a beautiful fully alive new world? *This* is the new world that Adam has been searching for millennia ever since he was

kicked out of heaven – and finds shelter nowhere. This is the lost paradise which is the pinnacle of his desires; the final destination of his hopes; and final hope of his life. This is the heavenly earth on whose gate is written in shining white moonlight color: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:97) – whoever enters this gate, would get complete peace and security.

Think my dear brothers! If by your struggle; if by your passion and drive; if by your warmth and love for humanity; if by your crying at night and rising in the early morning – the gates of this earthly heaven for humanity opens up and the atmosphere starts echoing with songs of …

Adam has risen and a revolution has happened;
In front of fistful of dust stars have bowed down!

…

Then what could be better than this for humanity's shining destiny. O caravan of passion! O travelers marching towards the destination of love! Move forward because the world is waiting and singing:

Bring on the revolution, bring the mirror shining;
We are eyeing at you with great promise longing!

May Allah's cosmic forces be with you and help you in this mission: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ (41:30-32) – People who proclaim that Allah alone is their Sustainer and remain firm and steadfast in their commitment so much so that no power on earth can influence them otherwise, then the heavenly forces will descend upon them and strengthen them further. They will say, "Have no fear, apprehension or grief; but rejoice and receive the happy news of the blissful life of heavenly society that has been promised to you." We are your close friends in this life; and we will be your close friends in the hereafter. You will therefore enjoy this blissful life in this world as well as in the life to come. In this blissful happy life you will get whatever you desire or ask for." Whatever you desire will happen and whatever you want will be provided. This will be the result of your unshakable faith and continuous work! All this will be provided to them with due grace and dignity, like the way a host caters to his guests. This will include provisions from Almighty which will protect them from all dangers; and will also contain means of their nurturing development.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

We are also Muslims like other Muslims

(Explanatory Remarks, Tulu-e-Islam Convention, November, 1956)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

My dear friends, this convention has been going well according to the formal program agenda for the past three days. But now I want to talk about some issues as a family by setting aside the formalities of the program. Time is short and a whole world of possibilities is calling on us. And I want to say something very important at this point.

I have been hearing some people declare that I became Muslim last year; that I became Muslim three years ago, etc. I know what they really want to say but the words they are choosing to express that are quite inappropriate. In fact, these words are misleading. Let me point out that we were Muslims before and we are Muslims now – the same kind of Muslims as other Muslims of the milieu, except that we want to understand the real framework of the دین (*Deen*) that Allah sent to humanity; and we want to know how it can be practically implemented in this piece of land. So, we cannot be different from other Muslims or consider ourselves in anyway superior to the rest of the Muslims. As for the meaning of the claim that "we have been Muslims for so many years …" – even this is not right because to be a Muslim is no child's play. As Allama Iqbal says:

It's to step in a witness stand of conviction;
People think it is easy to become a Muslim!

Another place he says:

Whenever I say I am Muslim, I tremble;
As I know the difficulties of "La Ilah"!

So, please tell me who it is among us who could really claim to be a Muslim in the true sense of its meaning? On the other hand, it is my claim that if only few of you who are present here could become true Muslims then there will be revolution in the world order.

Can anyone imagine the immense power of Momin?
Destinies get transformed by the glance of Momin!

Please ponder my friends! If that were the case then: would any of these issues and problems that we are facing today will remain? The Quran goes so far as to say that if you are a Muslim then you can surpass the limits of the Earth and the planets. If we had really and truly become Muslims for three years then

the destiny of the world would have changed. Therefore, we should not make a claim which is not supported by our character and deed. This is very serious.

Importance of prayer

I have also heard some members say that there is no need of prayers now that we have understood Islam. I want to ask such members: This is what Tulu-e-Islam has taught you that you should feel proud for not performing prayers? You continue to live non-Quran life and you are engaged in non-Islamic habits but you are prompted to talk like this now? And the irony is that you are engaged in such talks expressly by associating yourselves with Tulu-e-Islam. How great an allegation is this that you have leveled against Tulu-e-Islam?

I myself have personal weaknesses that I always admit. But it is extremely wrong to find excuses for one's own weaknesses and shortcomings. You are doing everything against the Quranic values and guidelines? Business, trade, banking, marriage, parties, and relationships – everything is going on? You didn't think of bringing them into line with the Quran? Then why is such talk when it comes to prayer? We can reform society only by starting it from within our own homes. But if we abandon our prayers and fasts then how will reformation take place? For God's sake please keep your words and deeds based on knowledge and sincerity. Do not look for "sacred" excuses. Instead, admit your weaknesses and shortcomings. We have to establish a Quranic society which can only be possible to do by leading an honest and sincere life.

However, you can say that we have understood the concept of دین (*Deen*) in *such and such* way; and that when it gets established practically then things will be done in *such and such* way. But you can start doing many things right now, e.g., fulfilling promises, speaking truth, not deceiving, etc. You don't need to wait for the دین (*Deen*) to be established for these?

When things reached my attention I had to clarify the reality of the situation.

Wrong methods

I do not want to say anything about your resolutions. But I do want to say that I have lit a small lamp with my blood and my wish is that it continues to remain lit while it moves forward. But it won't simply be lit by money because the oil that illuminates it comes from deep inside the heart and is more valuable than any (yellow, white or black) gold. To keep it illuminated requires flames of inner fire. There is no doubt that money is indispensable to propagate any thought, but money is not everything. In the words of Allama Iqbal:

The reason is something else, which you know that yourself;
The downfall of Muslim society is not due to lack of wealth!

Do not even think of using any wrong means in this sacred work? Please note that even one wrong step destroys everything in the path of حق (*Haq* or Truth). This lamp which illuminates the earth and the heavens – نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ – cannot be lit by wrong means. Every member of our movement should be such that, by looking at him from afar, people can say that here comes a living example of Quranic thought. When the Prophet (PBUH) was asked about the truthfulness of his mission then he simply replied: فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16) – I have dwelt amongst you all my life before (this revelation came to me). Can't you understand this much? Please remember this: To tread on the Quranic path among the crowd of enemies is a tall claim. This difficult journey can't be covered with external resources. The seeds of our movement will sprout from the depth of our hearts; and their rise and growth will tell everyone what the universal system of sustenance is? Propagating the literature alone will also not be able to achieve anything. Adam was told: وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ (2:36) – and on earth you shall have your abode and your livelihood for a while [Asad]. The Earth provides support for our subsistence. We will definitely make use of its resources. But this support should be like the water that supports a ship. But the same water if it goes inside the ship during storm – then you know what happens to the ship? Therefore, do not let material supports overwhelm the ship of your struggle and travails. Keep these material supports under check of the power of your Iman. To bring about Quranic revolution in front of the world use honesty, steadfast determination, fortitude, sincerity, patience, and perseverance. And have 100% conviction in the Quranic mission.

Lot of propaganda is being directed against this movement. Many false rumors are being circulated against you. But you prove by your actions that you are neither a religious sect nor a political party. We are also aboard the Millat's ship together with others. If God forbid, this ship were to go down we will also drown along with others.

It is our good fortune that we got a piece of land for the establishment of the Quranic system. The association of Tulu-e-Islam with the Pakistan movement was precisely because of this: that it is not possible to establish the دین (*Deen*) without having a piece of land. Now that we have got that piece of land, all our struggles must be so that that دین (*Deen*) gets established here. From your side nothing whatsoever should happen that might be detrimental in any way to this land called Pakistan. To defend this land is your first and the foremost duty no matter even if you have to put your life on the line in order to do that.

O Almighty, the Creator of the Universe, O Allah! We have come to you with our utmost sincere and true feelings for understanding your Book and to follow it and to try our best to establish it.

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہوذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

جوانوں کو مری آہِ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے